شمارہ ۱۳، ۲۰۲۴ء

نمود

طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

نگران: زاہد حسن

نائب مدیران: محمد شجیع سہیل فاروقی، فروا مجاہد

مرکزِ زبان و ادب
LUMS | Gurmani Centre for Languages and Literature

فہرست مدیران نمود ۲۰۱۲ء تا۲۰۲۳ء

شمارہ ۱، ۲۰۱۲ء	مدیر:	عمر نعیم سکھیرا
شمارہ ۲، ۲۰۱۳ء	مدیر:	سارہ فاطمہ
شمارہ ۳، ۲۰۱۴ء	مدیر:	فرقان اشرف
شمارہ ۴، ۲۰۱۵ء	مدیران:	محمد عاکف رمضان، سید عمار اختر کاظمی
شمارہ ۵، ۲۰۱۶ء	مدیران:	وکش اویس، اسد اللہ خان
شمارہ ۶، ۲۰۱۷ء	مدیر:	اسد اللہ خان
شمارہ ۷، ۲۰۱۸ء	مدیر:	محمد بلال اعظم
شمارہ ۸، ۲۰۱۹ء	مدیر:	محمد بلال اعظم
شمارہ ۹، ۲۰۲۰ء	مدیر:	راز احتشام
شمارہ ۱۰، ۲۰۲۱ء	مدیران:	مالی وسان، شیریں عباس
شمارہ ۱۱، ۲۰۲۲ء	مدیران:	مریم عامر، نتالیہ حیات
شمارہ ۱۲، ۲۰۲۳ء	مدیران:	فاطمتہ الزہرا، محمد زوہیب احمد

فہرست

اداریہ	زاہد حسن		۵

اردو

مضامین

کچرا بابا	محمد زوہیب احمد	(طالب علم لمز)	۸
”اوور کوٹ“ از غلام عباس	راحمہ عمران	(طالبہ لمز)	۱۷
سعادت حسن منٹو اور ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“	شانزے	(طالبہ لمز)	۲۲
فیض کی ایک غزل کا مطالعہ	ارفع یٰسین	(طالبہ لمز)	۲۸
فیض احمد فیض کی شاعری پر ایک مکالمہ	محمد صننان	(طالب علم لمز)	۳۴
میری زندگی کی ناقابلِ فراموش شخصیت	منتہا فاطمہ	(طالبہ لمز)	۳۷

افسانے / کہانیاں

مشعلِ او جھل	تیمور علی	(طالب علم لمز)	۳۹
گتھیاں	فاطمہ اسلام	(طالبہ لمز)	۴۴
سردی کی راتیں	احمد فراز	(طالب علم لمز)	۴۹

پنجابی

مضامین

لوک داستانیں	راحم مظہر	(طالب علم لمز)	۵۵
پنجابی شعری اصناف	طلحہ حسنین	(طالب علم لمز)	۶۳

پنجابی داستانیں	فہامہ عبد الرحمٰن	(طالب علم لمز)	۷۳
حضرت بابا فریدؒ گنج شکر	احمد علی	(طالب علم لمز)	۷۹
”پنجابی توں اردو تراجم“	ملک مودّت حسین	(طالب علم لمز)	۸۷

کہانیاں

”میں ول آساں“	ندیم احمد	(طالب علم لمز)	۹۲

ڈائری نویسی

پیاری ڈائری	عائزہ شجاع	(طالبہ لمز)	۹۵
میری پیاری ڈائری	رفیعہ شکیل	(طالبہ لمز)	۹۹

فارسی

تجربہ من در کلاس زبان فارسی	معروف مہدی	(طالب علم لمز)	۱۰۵
کلاس زبان فارسی	محمد سلیمان رزاق	(طالب علم لمز)	۱۰۷
مہربان دوست	محمد زین	(طالب علم لمز)	۱۰۹

سندھی

دوست ناهيان آهيان ساٿ	اشوک کمار کھتری	(استاد سندھی زبان، لمز)	۱۱۲
سپني دوستن کي سلام	ثنا زاہد	(طالبہ لمز)	۱۱۳

بلوچی

بلوچی نظم: نیاز مری (ترجمہ و تشریح)	ظہیر بلوچ	(طالب علم لمز)	۱۲۶

عربی

خلیفہ اور بوڑھا آدمی (عربی سے ترجمہ)	محمد ندیم شاہ	(طالب علم لمز)	۱۲۸

اداریہ

گُرمانی مرکزِ زبان و ادب کی جانب سے طلبا و طالبات کی تحریروں پر مشتمل نمود کا یہ تیرھواں شمارہ ہے۔ یہ تمام تر شمارہ طلبا کی تخلیقی و تنقیدی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ طلبا و طالبات جو گُرمانی مرکزِ زبان و ادب کے تحت پڑھائی جانے والی زبانیں سیکھ رہے ہیں، عمومی طور پر وہ ان نئی سیکھی گئی زبانوں میں اپنے خیالات کے اظہار کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ بنیادی انسانی فطرت میں بھی شامل ہے کہ انسان اپنے سیکھے ہوئے علم اور زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر ہم نمود کے گذشتہ شماروں میں شامل طلبا کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف تخلیقی اظہار کی گوناگوں قوّت رکھتے ہیں بلکہ انھوں نے وہ زبان جس میں انھوں نے لکھا ہے اس کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت کا مطالعہ بھی کر رکھا ہوتا ہے اور اس کی گرامر اور روز مرّہ محاورے کا بھی شعور و ادراک ان کی تحریروں سے جھلکتا ہے۔ اگرچہ گُرمانی مرکز کے تحت زبانوں کی تعلیم پچھلے کئی برس سے دی جا رہی ہے۔ تاہم طلبا کی تحریروں پر مشتمل اس شمارے میں عربی، فارسی سمیت پاکستانی زبانوں جیسے پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو میں لکھی گئی نگارشات پچھلے چار شماروں سے شائع کی جانے لگی ہیں جو نہایت مثبت پہلو ہے کہ اس سے پاکستان بھر کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے طلبا و طالبات نہ صرف دیگر صوبوں کی زبانوں کی چاشنی سے لطف اُٹھاتے ہیں بلکہ اس میں لکھے جانے والے ادب کی تاریخ اور تجربے سے بھی آگہی حاصل کرتے ہیں، گُرمانی مرکز زبان و ادب (لمز) پاکستان بھر کی یونیورسٹیوں میں شاید واحد یونیورسٹی ہے جہاں ہمیں پاکستان بھر میں بولی جانے والی زبانوں اور ثقافتوں کی رنگا

رنگی کا نمایاں اظہار ملتا ہے بلکہ یہ باہمی رواداری اور قومی یکجہتی کے فروغ اور اس کی نشوونما میں بھی کلیدی کردار ادا کر رہا ہے اور اس سارے عمل میں نمود کی تحریروں کے طلبا پر اثرات بھی قابل ستایش ہیں۔

انسانی تواریخ میں فنونِ لطیفہ نے انسان کی تخلیقی، نفسیاتی، وجودی اور روحانی بلاغت کو بڑھانے میں اور اس میں اخلاقی، سماجی اور تہذیبی اقدار پیدا کرنے میں ہمیشہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس میں بھی خاص طور پر شعر وادب کا کردار ناقابلِ فراموش رہا ہے کہ تعلیمی اداروں میں ''بزمِ ادب'' اور ان کے نصابات میں نثری و شعری تحریریں جزوِلازم کے طور پر شامل رہی ہیں، اگر دیکھا جائے تو ''نمود'' اسی سوچ کا تسلسل ہے۔

نمود ۲۰۲۴ء میں اردو تحریروں پر مشتمل ایک بڑے حصّہ کے ساتھ اس بار پنجابی، فارسی، سندھی، بلوچی، اور عربی زبانوں کی تخلیقات اور تراجم بھی شامل ہیں، جن کا مطالعہ یقیناً نمود کے پڑھنے والوں خاص طور پر لمز میں زبانوں اور ادب کے طلباء کے لیے بے حد سُود مند ثابت ہو گا۔ ہم ان تحریروں کے لیے ان زبانوں کے اساتذہ اور طلبا کے تہہ دل سے شُکر گزار ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ وہ نمود کے آیندہ شماروں کے لیے بھی اپنا تعاون جاری رکھیں گے۔

مدیران

اردو

محمد زوہیب احمد

کچرا بابا

مصنّف کا نام و تعارف: کرشن چندر ایک مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار تھے جو اردو اور ہندی میں لکھتے تھے۔

پیدائش:

آپ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو وزیر آباد (اب پاکستان) میں پیدا ہوئے۔

زندگی:

کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی میں مختلف موضوعات پر لکھا جن میں سے خاص طور پر برصغیر کی تقسیم اور بنگال کے قحط پر ان کے افسانے اردو ادب کے بہترین شاہکار میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک انسان دوست ادیب تھے جو دہشت گردی، فرقہ واریت، انتہا پسندی اور ذات پات کے خلاف مسلسل آواز اٹھاتے رہے۔

تصانیف:

کرشن چندر نے اپنی زندگی میں ۱۰۰ سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں ناول، مختصر کہانیاں، ڈرامے، طنز و مزاح، فلموں کے اسکرپٹس اور بچوں کی کتابیں شامل ہیں۔ ان کی کچھ نمایندہ کتب درج ذیل ہیں:

ناول:

- شکست (۱۹۵۰ء)

- غدّار (۱۹۵۱ء)
- جب کھیت جاگے (۱۹۵۲ء)
- ایک گدھے کی سرگزشت (۱۹۵۷ء)
- خون اور خوشبو (۱۹۶۹ء)

افسانوی مجموعے:

- پگھلا نیلم (۱۹۴۴ء)
- دو فرلانگ لمبی سڑک (۱۹۵۴ء)
- ایک وائلن سمندر کے کنارے (۱۹۶۲ء)
- نئی دہلی کی دوشیزہ (۱۹۶۳ء)
- مٹھی بھر چاندنی (۱۹۶۴ء)

بچوں کی کتابیاں:

اس میں کھلونے اور بچوں کے کرشن چندر (۱۹۶۵ء) شامل ہیں۔

- تازہ ہوا کا جھونکا۔
- چاندنی بیگم
- کاغذ کی ناؤ
- سفید بوند

وفات:

آپ ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو ممبئی بھارت میں انتقال کر گئے۔

کہانی کا خلاصہ:

یہ کہانی ایک ایسے آدمی کی ہے جو ایک طویل بیماری اور سرجری کے بعد ہسپتال سے نکلتا ہے۔ حالاں کہ اس کی حالت ابھی بھی نازک ہوتی ہے۔ اس کی بیوی دُلاری اس کے علاج کے لیے اپنے زیورات بیچ دیتی ہے لیکن پھر بھی ان کی مشکلات کم نہیں ہوتیں۔ دُلاری کی محنت کے باوجود شوہر کی بیماری اور سرجری نے ان کی زندگیوں کو برباد کر دیا۔ ان کا بچہ بھی ضائع ہو گیا اور دُلاری کو مزید مشقت کے سبب نقصان اٹھانا پڑا۔

آدمی جب نوکری کھو دیتا ہے تو وہ اپنی حالت زار کی وجہ سے بے گھر ہو جاتا ہے۔ وہ کچرے کے ڈبے سے خوراک تلاش کر کے زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ برسوں تک وہ اسی حالت میں زندگی گزارتا ہے، اور ''کچرا بابا'' کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔

ایک رات کچرے کے ڈبے میں اسے ایک نوزائیدہ بچہ نظر آتا ہے جو کہ اپنے وجود کا اعلان چیخ چیخ کے کر رہا ہوتا ہے۔ کچرا بابا بچے کو اٹھاتا ہے اور آم کی گٹھلی کے ذریعے بچے کو خاموش کروانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو دیکھ کر اُسے اپنی بیوی دُلاری اور اپنا کھویا ہوا بچہ یاد آجاتا ہے۔

یہ بچہ کچرا بابا کی زندگی میں ایک نیا مقصد لاتا ہے۔ کچرا بابا اسے سنبھالنے اور پالنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ آخر میں لوگ دیکھتے ہیں کہ کچرا بابا کچرے کے ڈبے کے پاس نہیں ہے بلکہ ایک تعمیراتی سائٹ پر اینٹیں ڈھو رہا ہے جب کہ بچہ قریب میں سکون سے سو رہا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بچے کے آنے سے کچرا بابا کی زندگی میں مثبت بدلاؤ آیا ہے اور اب وہ اپنی زندگی کو ایک نئے طریقے سے گزارنا شروع کر دیتا ہے۔

کرشن چندر کی کہانی کا تجزیہ:

کرشن چندر کی اس کہانی میں انسان کی زندگی کے نشیب و فراز کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو کہ زندگی کی تلخیوں اور مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے ایک بیمار آدمی کی حالت زار، اس کی مشکلات اور

اس کے گھر کی تباہی کو بہت ہی دل گیر انداز میں پیش کیا ہے۔

تجزیہ:

کرشن چندر اُردو ادب کے معروف اور قابل ذکر افسانہ نگار ہیں جن کی تحریریں انسانی جذبات، سماجی مسائل اور معاشرتی حقیقتوں کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اس کہانی میں کرشن چندر نے ایک انسان کی زندگی کی مشکلات اور مصائب کو نہایت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔

کردار نگاری:

کہانی کے کردار نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور گہرائی کے حامل ہیں۔

مرکزی کردار:

یہ کردار بیمار اور ناتواں آدمی کا ہے۔ جو طویل بیماری اور سرجری کے بعد ہسپتال سے نکالا جاتا ہے۔ اس کی جسمانی حالت نہایت نازک ہوتی ہے اور وہ کمزور اور بے بس دکھائی دیتا ہے۔ اس کی مشکلات اور بے بسی کا بیان کرنا کہانی کو مزید اثر انگیز بناتا ہے۔ اس کردار کی بے بسی اور اس کے حالات کی تلخی کہانی کا مرکزی محور ہیں۔ اس کی مشکلات اور مصائب کا ذکر قارئین کو انسانی زندگی کی ناپائیداری اور مشکلات کی یاد دلاتا ہے۔

دُلاری:

دُلاری کہانی کا ایک کردار ہے جو اپنے شوہر کی بیماری کے دوران اس کی مدد کرتی ہے۔ اُس کی محبت اور قربانیاں کہانی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ دُلاری کی محبت اور اس کی محنت کی داستان دل کو چھونے والی ہے۔ اس کی مشکلات اور قربانیوں کا ذکر کہانی میں بہت موئثر انداز میں کیا گیا ہے۔

کچرا بابا:

کچرا بابا کا کردار کہانی میں ایک بے بس اور نادار انسان کی علامت ہے جو کچرے کے ڈبے سے خوراک تلاش کرتا تھا اور اپنی زندگی کو کسی نہ کسی طرح گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔ کچرا بابا کی زندگی کی مشکلات اور اس کی جدوجہد کہانی کا اہم پہلو ہیں۔ اس کی زندگی کی تلخ حقیقتیں اور اس کی بے بسی کا ذکر کہانی کو مزید گہرائی عطا کرتا ہے۔

موضوعات:

کہانی میں کئی اہم موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں انسانی مشکلات اور مصائب شامل ہیں۔ جو انسان کی زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں۔

انسانی مشکلات:

کہانی کا مرکزی موضوع انسانی مشکلات اور مصائب ہیں۔ مصنف نے بیماری بے روزگاری اور بے گھری جیسے مسائل کو نہایت موئثر انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی کے کرداروں کی زندگی کی مشکلات اور ان کی جدوجہد انسانی زندگی کی تلخیوں کو بیان کرتی ہے۔

قربانی اور محبت:

دُلاری کی قربانیاں اور اس کی محبت کہانی کا اہم موضوع ہیں۔ اس کی محنت اور محبت کی داستان دل کو چھونے والی ہے۔ دُلاری کی محبت اور اس کی قربانیاں انسانی محبت اور وفاداری کی بہترین مثالیں ہیں۔

معاشرتی مسائل:

کہانی میں معاشرتی مسائل جیسے بے روزگاری، غربت اور بے گھری کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اسے نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی میں کچرا بابا کی زندگی کی تلخی اور اس کی مشکلات معاشرتی

نابرابری اور عدم انصاف کی عکاسی کرتی ہیں۔

علامتی عناصر:

کہانی میں کئی علامتی عناصر استعمال کیے گئے ہیں جو کہانی کو مزید گہرائی اور معنی دیتے ہیں۔

کچرے کا ڈبہ:

کچرے کا ڈبہ کہانی میں معاشرتی بربادی اور انسان کی بقاء کی علامت ہے۔ کچرا بابا کی زندگی کا انحصار اس کچرے کے ڈبے پر ہے جو اس کی بقا کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

نوزائیدہ بچہ:

نوزائیدہ بچہ کہانی میں امید اور ایک نئی زندگی کی علامت ہے۔ اس بچے کی آمد سے کچرا بابا کی زندگی کو نئی روشنی ملتی ہے۔

بیانیہ اسلوب:

کرشن چندر کا بیانیہ اور اسلوبِ نگارش سادہ لیکن دل کو چھونے والا ہے۔

بیانیہ:

کہانی کا بیانیہ نہایت ہی دل گداز اور موئثر ہے۔ مصنف کہانی کے اہم کرداروں کی زندگی کی مشکلات اور ان کی جذباتی حالت کو نہایت ہی موئثر انداز سے بیان کرتے ہیں۔ کہانی کے مکالمے اور تفصیلات پڑھنے والے کو جذباتی طور پر متاثر کرتے ہیں اور کہانی کی گہرائی بڑھاتے ہیں۔

اسلوب:

کرشن چندر کا اسلوب سادہ لیکن موئثر ہے۔ انھوں نے کہانی کو نہایت حقیقت پسندانہ اور سادہ انداز میں

پیش کیا ہے۔

اختتام:

کرشن چندر نے اپنی اس کہانی میں انسانی زندگی کی مشکلات اور مصائب کو بہت ہی خوبصورت اور موئثر انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی کے کردار، موضوعات اور علامتی عناصر سب اپنی مثال آپ ہیں۔ اور یہ سب مل کر ایک دلگداز داستان کو جنم دیتے ہیں۔ جو قارئین کے دلوں کو چھو لیتی ہے۔ کچرا بابا کی زندگی کی مشکلات اور اس کی جدوجہد کی داستان انسان کی بقاء اور اُمید کی بہترین مثال ہے۔

کہانی کا اختتام انسانی زندگی کی ناپائیداری اور امید کی علامت ہے جو کہانی کو ایک نیا موڑ دیتا ہے۔ اور پڑھنے والے کو انسانی زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کرتا ہے۔

کرشن چندر نے اس کہانی میں انسانی جذبات اور معاشرتی مسائل کو نہایت خوبصورت اور حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریریں آج بھی اتنی ہی متعلقہ اور اثر انگیز ہیں جتنی ان کے زمانے میں تھیں۔ ان کی دیگر کہانیوں میں بھی انسانی زندگی کی مشکلات اور ان کی جدوجہد کی داستانیں ہمیشہ دل کو چھو لینے والی ہوتی ہیں۔

تنقیدی جائزہ:

کرشن چندر کی کہانی ''کچرا بابا'' ایک نادار اور بیمار انسان کی زندگی کی مشکلات پر مبنی ہے۔ وہ اس کہانی کے ذریعے غریب آدمی کی زندگی مشکلات اور معاشرتی ناانصافی کا آئینہ پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ غریب آدمی کی زندگی کی جدوجہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ کہانی کے کئی پہلو ہیں جو اسے متاثر کن اور یادگار افسانہ بناتے ہیں۔ یہاں پر میں کہانی کی خوبیوں، خامیوں اور اس سے حاصل کردہ سبق کا جائزہ لوں گا۔

اس افسانے میں کرشن چندر نے کرداروں کو نہایت حقیقت پسندانہ اور جاندار انداز میں پیش کیا ہے۔

مرکزی کردار، ڈُلاری اور کچرا بابا کا ہے جس کے ذریعے کرشن چندر انسانی زندگی کی تلخیوں اور محبت کو بیان کرتے ہیں۔ کچرا بابا کا کردار معاشرتی بے ثباتی اور انسانی بقاء کی علامت ہے جو کہانی کو ایک منفرد اور معنی خیز موڑ دیتا ہے۔

کہانی کے موضوعات انسانی مشکلات، قربانی، محبت اور معاشرتی مسائل، غریبوں کی زندگی کی مشکلات کہ کیسے ایک انسان اپنا سب کچھ بیچ دیتا ہے اور پھر بھی اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا، اور وہ اکیلا رہ جاتا ہے جیسے کہ کچرا بابا سب کچھ کھو کر سڑک پر آجاتا ہے۔ کرشن چندر کا بیانیہ سادہ ہے لیکن دل کو چھو لینے والا ہے۔ کہانی کا ہر جزو قاری کو جذباتی طور پر متاثر کرتا ہے۔ مصنف کا اسلوب حقیقت پسندانہ ہے جو کہ کہانی کو مزید جاندار بناتا ہے۔

کہانی میں دیئے گئے علامتی عناصر جیسے کہ کچرا بابا، کچرے کا ڈبہ، نوزائیدہ بچہ، کہانی کو گہرائی اور نئے معنی دیتے ہیں۔ کہانی البتہ بہت منفرد انداز میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کی طوالت بعض مقامات پر قارئین کو تھکا دیتی ہے۔ اور کچھ حصے مزید مختصر ہو سکتے تھے تاکہ کہانی کی روانی برقرار رہ پاتی۔ ڈُلاری کا کردار مزید اچھی طرح بیان کیا جا سکتا تھا کہ آخر کار اس کا کیا بنا۔ بعض مقامات پر تفصیلات کی بھرمار بعض اوقات کہانی کی تاثیر کو کم کر سکتی ہے۔ کہانی میں مکالمات کی کمی ہے۔ جو کہ کرداروں کے جذبات اور خیالات کو مزید واضح کر سکتی تھی۔ مکالمات کے ذریعے کرداروں کی جذباتی کیفیت کو مزید اجاگر کیا جا سکتا تھا۔ اس افسانے سے مندرجہ ذیل اسباق حاصل ہو سکتے ہیں۔ کہانی میں انسانی بقاء کی طاقت اور عزم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کچرا بابا کی زندگی کی مشکلات اور اس کی جدوجہد انسانی قوت ارادی کی بہترین مثال ہے۔

کہانی یہ سکھاتی ہے کہ مشکلات اور مصائب کے باوجود انسان کو ہار نہیں ماننی چاہیے۔ ڈُلاری کی قربانیاں اور اس کی محنت و محبت کی کہانی میں ہمارے لیے بعض اہم سبق موجود ہیں۔ اس کی محنت و محبت انسانی محبت اور

وفاداری کی عکاسی کرتے ہیں۔ کہانی یہ پیغام دیتی ہے کہ محبت اور قربانی زندگی کی مشکلات کو کم کر سکتی ہیں۔

کہانی معاشرتی بے ثباتی اور عدم انصاف کی عکاسی کرتی ہے۔ کچرا بابا کی زندگی کی تلخ حقیقتیں اور اس کی بے بسی معاشرتی مسائل کو اجاگر کرتی ہیں۔ کرشن چندر کی کہانی ایک متاثر کن اور یادگار کہانی ہے جو کہ زندگی کی مشکلات اور مصائب کو نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور دلگداز انداز میں بیان کرتی ہیں۔

کہانی میں موضوعات اور علامتی عناصر سب مل کر ایک پر جوش داستان کو جنم دیتے ہیں جو قارئین کے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔ کہانی سے حاصل ہونے والے اسباق انسانی بقاء کی طاقت، قربانی اور محبت اور معاشرتی ،بے ثباتی کو اجاگر کرتے ہیں۔ کرشن چندر کی کہانی میں انسانی جذبات اور معاشرتی مسائل کو نہایت اچھے اور سادہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تحریروں میں بیان کی گئی باتیں آج بھی اتنی ہی متعلقہ اور اثر انگیز ہیں جتنی ان کے زمانے میں تھیں۔ ان کی کہانیوں میں انسانی زندگی کی مشکلات اور ان کی جدوجہد کی داستانیں ہمیشہ دل کو چھونے والی ہوتی ہیں۔

❋❋❋

راحمہ عمران

”اوورکوٹ“ از غلام عباس

غلام عباس ۱۷ نومبر ۱۹۰۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے کراچی ہجرت کرلی۔ آپ مصنف، مترجم اور میگزین ایڈیٹر تھے۔ آپ کی مختصر مگر پراثر کہانیاں آپ کی وجہ شہرت بنیں۔ روز مرہ کے معاملات کو باریک بینی اور مہارت سے سبق آموز بنانا آپ کی خاصیت تھی۔ آپ کی مشہور تخلیقات میں ”چاندنی“، ”دھنک“ اور ”آنندی“ وغیرہ شامل ہیں۔ کلیاتِ غلام عباس میں ان کی تمام مختصر اور طویل کہانیاں، ڈرامے، شاعری اور دیگر تخلیقات شامل ہیں۔

آپ کا ایک مشہور زمانہ افسانہ ”آنندی“ طوائفوں کی بستی کے بارے میں ہے جو دلی کے گردونواح میں واقع ہے اور اس کے سامنے سے وہ تقریباً روز گزرتے تھے۔ اس کہانی کے بارے میں مشہور نقاد محمد حسن عسکری کا کہنا ہے کہ غلام عباس کی مہارت صرف اس کہانی کے مرکزی خیال سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس صبر اور صلاحیت سے ہوتی ہے جس سے وہ اس بستی کی عمارتوں اور گلیوں کا نقشہ کھینچتے ہیں، گویا قاری انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے۔

آپ کی ایک اور وسیع پیمانے پہ پڑھی جانے والی کہانی ”کتبہ“ ایک معمولی کلرک کی زندگی کے بارے میں ہے جو اپنے گھر کے سامنے والے دروازے پر اپنے نام کی تختی لگوانے کی سادہ سی خواہش بھی پوری نہ کر پایا اور آخر کار وہ تختی اس کی قبر پر لگی۔

”اوورکوٹ“ پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں ادبی میگزین سویرا میں شائع ہوئی۔ جاذب طرز تحریر اور تجسّس

آمیز بیانیے کی وجہ سے یہ کہانی ادبی کلاسیک میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں ہوتا کچھ یوں ہے کہ جنوری کی ایک سرد شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے مال روڈ پر نکلا اور چیئرنگ کراس کی طرف چلنے لگا۔ اپنے حلیے سے وہ نوجوان خاصا فیشن ایبل اور مال دار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی قلمیں لمبی، بال چمکتے ہوئے اور مونچھیں باریک تھیں۔ اوپر ایک سبز فلیٹ ٹوپی اور نیچے ایک بادامی رنگ کا اوور کوٹ جس میں گلاب کا ایک ادھ کھلا پھول ٹنکا ہوا تھا۔

سردی کا اس پر کوئی اثر معلوم نہ ہو رہا تھا بلکہ وہ اس سے محظوظ ہوتا نظر آرہا تھا۔ تانگے والے اس کو دیکھ کر دوڑے آتے پر وہ انھیں منع کر دیتا۔ ایک ٹیکسی کو بھی اس نے ''نو تھینک یو'' کہہ کر روانہ کر دیا۔ جہاں جاڑے کی ٹھنڈ تنہائی اور افسردگی کے جذبات جگاتی ہے وہیں شہر کا امیر طبقہ اس سے محفوظ ہونے کو گھروں سے باہر نکل آتا ہے۔ مال روڈ پر بے حد رش تھا، ایک بینچ تاڑ کر وہ نوجوان اس پہ بیٹھ گیا۔ وہ اپنے سامنے سے گزرنے والے مرد و زن کا جائزہ لے رہا تھا مگر ان کی شکلوں سے زیادہ اس کا دھیان ان کے کپڑوں پر تھا۔ نوجوان کا اپنا اوور کوٹ خاصا پرانا تھا مگر اس پر کوئی سلوٹ نہ تھی جیسے اس کا بہت خیال رکھا جاتا ہو۔

اتنے میں ایک پان والا آیا۔ جس سے نوجوان نے دس روپے کے نوٹ کا چینج مانگا جو اس کے پاس نہ تھا۔ نوجوان کے پاس اکنّی نکل آئی اور اس نے ایک سگریٹ خرید کے دھیمے دھیمے کش لگانا شروع کر دیے۔ پھر اس نے سینما ہال کا رُخ کیا، فلموں کی تصویریں دیکھیں اور باہر نکل آیا۔ آگے جا کر وہ آلاتِ موسیقی کی ایک بڑی دکان میں جا پہنچا۔ تھوڑی دیر وہاں ٹہل کر ملاحظہ کیا اور اس مہینے کے گراموفون ریکارڈز کی فہرست لے کر باہر نکل آیا۔ پھر قالینوں کی دکان میں جا کر بھی ونڈو شاپنگ کی اور بہت احترام سے دکان دار سے کہا کہ وہ کچھ لینے نہیں ابھی صرف دیکھنے آیا ہے۔

اب وہ ہائی کورٹ کی دکانوں کے سامنے آگیا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی ایک انگلی سے گھمانے کی

کوشش کی پر ناکام رہا تو ''اوہ سوری'' کہہ کر اسے واپس اُٹھالیا۔ چلتے چلتے اس کے آگے سے ایک جوڑا گزرا جس کی گفتگو نے اسے اپنی طرف متوّجہ کر لیا۔ اس سے پہلے اسے کسی کی بھی باتوں میں دل چسپی نہ ہوئی تھی پر اب وہ چوکنّا ہو کر ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ ان کے تعاقب میں سڑک کراس کر ہی رہا تھا کہ ایک اینٹوں سے بھری لاری اسے رگڑتی ہوئی نکل گئی۔ راہ گیروں نے جو یہ منظر دیکھ رہے تھے شور مچایا کہ لاری کا نمبر دیکھو پر وہ ہوا ہو چکی تھی۔ جوں توں کر کے لوگوں نے ایک گاڑی روک کر اس نوجوان کو ہسپتال بھیجا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کچلی گئی تھیں اور بہت سا خون بہہ چکا تھا۔

جب اسے آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا تو اس کے اوور کوٹ کو دیکھ کر نرسوں کی آپس میں گفتگو چھڑ گئی۔ دیکھنے میں تو بھلے خاندان کا لگتا ہے، شہناز نے گُل سے کہا۔ آپریشن کے لیے جب اس کے کپڑے اتارے گئے تو جو منظر سامنے آیا اس نے دونوں نرسوں کے ہوش اڑا دیئے۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے ٹائی تو کیا قمیص کا بھی نام و نشان نہ تھا۔ ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا اونی سویٹر تھا جس کے نیچے سے ایک اور پُرانا بنیان جھانک رہا تھا۔ اس کا جسم گرد سے اٹا ہوا تھا۔ جیسے دو مہینوں سے نہایا نہ ہو لیکن چہرہ گردن تک صاف تھا بلکہ اس پہ پاؤڈر بھی لگا ہوا تھا۔ پتلون کے دونوں گھٹنوں پر یہ کپڑا منسلک کیا گیا تھا مگر یہ حصّہ اوور کوٹ کے نیچے ہی رہتا تھا۔ اور پتلون کو بیلٹ یا بٹن کے بجائے ایک دھجی سے کس کر باندھا ہوا تھا۔ بوٹ پرانے تھے مگر خوب پالش کیے ہوئے مگر اندر سے دونوں موزے الگ اور ایڑیوں سے پھٹے ہوئے تھے۔ کپڑے اتارتے ہوئے اس کا منہ دیوار کی طرف ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور روح کی برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے نظریں نہیں ملا پا رہا۔

اس کہانی میں غلام عباس نے معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتے ہوئے نچلے طبقے کی خواہشات اور دشواریوں کو بیان کیا ہے۔ کہانی کے شروع میں نوجوان کے حلیے کی تفصیل سے ایسا لگتا ہے کہ کوئی بہت

اونچے گھرانے اور رکھ رکھاؤ والا شخص ہے کیوں کہ وہ جدید دور کے فیشن ٹرینڈ آزماتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چلنے کے انداز اور چہرے کے تاثّرات سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ دُنیا سے بے نیاز صرف خود میں مگن ہے۔ نہ ہی کوئی گھر گرہستی کے، نہ مال و متاع اور نہ ہی کام کاج کے مسائل، وہ صرف اس شام کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اور جس طرح وہ انگریزی بولتا، اس سے یہ لگتا تھا کہ وہ کہیں اچھی جگہ سے تعلیم بھی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے ہر عمل سے شگفتگی اور وضع داری جھلکتی تھی۔

مال روڈ پر مٹر گشت کرتے ہوئے سٹالوں کا جائزہ لیتے وقت اس نے بہت تہذیب اور تمیز سے جو رسالہ جہاں سے اٹھایا اسے وہیں واپس رکھا۔ ایرانی قالینوں کی دکان پر بھی اس نے بہت مہذب انداز میں دکان دار سے کلام کیا کہ وہ ابھی صرف ریکی کرنے آیا ہے۔ اسی طرح جب وہ ریسٹورنٹ کے سامنے دُھن سن رہا تھا اور جب وہ موسیقی کے آلات کی دکان میں جا کر جائزہ لے رہا تھا تو اس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ کوئی فن کا قدر دان اور ماہر ہے جو بے حد باذوق اور گہری نگاہ رکھتا ہے۔

لیکن اس نوجوان کے پوسٹ مارٹم کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات کچھ اور ہی ہے۔ وہ خوش پوش لبادہ، وہ رکھ رکھاؤ، وہ بن ٹھن کر چلنا سب ایک سراب تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ایک معمولی شخص تھا جو غربت کا پالا، کبھی وہ رعب اور دبدبہ آمیز تجربہ نہ کر سکا تھا، جو جیب میں پیسہ ہونے سے آتا ہے۔ اور یہ سب ڈھونگ کر کے وہ اسی کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کئی مسائل نظر آتے ہیں جو اسے اس سب پر مجبور کر رہے تھے جیسے کہ احساس کمتری، کھوکھلا پن منقسم شخصیت اور تنہائی۔

یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم مال دار اور انگریزی بولنے والوں کو خود بہ خود ہی عزت دینا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ اس عزت کے قابل ہیں بھی یا نہیں۔ بر عکس اس کے غریب آدمی کو نہ صرف روزی روٹی کے بلکہ عزت کمانے کے لئے بھی بہت پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ اوور کوٹ ایک علامت تھا جو ایک

جگہ اس نوجوان کو طبقے کا خوش حال، خوش باش فرد ظاہر کر رہا تھا اور دوسری طرف اُس کی غربت اور کم مائیگی کو چھپا رہا تھا۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں امیر طبقہ خوشی اور کامیابی کے معیار طے کرتا ہے اور غریب طبقہ ساری عمر اِن غیر حقیقی معیاروں کو پانے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اس دیوار کو پھلانگ نہیں پاتے اور ناکامی کے احساس سے دبے رہ جاتے ہیں۔

اس کہانی سے ایک اور سچ اُبھر کر سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس فانی زندگی کی ناپائیداری۔ یہ کبھی بھی کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے۔ ہم اس حقیقت کو فراموش کر کے اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جب کہ بھروسہ تو ایک پل کا بھی نہیں ہے۔ جان تو کسی بھی سیکنڈ جا سکتی ہے مگر ہم لوگوں کو متاثر کرنے اور ان کی توجہ حاصل کرنے کے پیچھے لگ کے وقت اور قوت ضائع کر دیتے ہیں اور اس سے پہلے کہ آپ کو معلوم ہو، زندگی تمام ہو جاتی ہے۔

❁ ❁ ❁

شائزے

سعادت حسن منٹو اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''

جھوٹی دنیا کا سچّا افسانہ نگار

''میری زندگی اک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کردوں، کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ اس ملبہ کے ڈھیر پر اک نئی عمارت کھڑی کر دوں۔'' منٹو

منٹو کی زندگی کے افسانوں کی طرح نہ صرف یہ کہ دل چسپ بلکہ مختصر بھی تھی۔ محض ۴۲ سال کی چھوٹی سی زندگی کا بڑا حصّہ منٹو نے اپنی شرائط پر، نہایت لاپروائی اور لا ابالی پن سے گزارا۔ انھوں نے زندگی کو ایک بازی کی طرح کھیلا اور ہار کر بھی جیت گئے۔ غیر اردو داں طبقہ اردو شاعری کو اگر غالب کے حوالہ سے جانتے ہیں تو فکشن کا حوالہ منٹو ہیں۔ تقریباً ۲۰ سالہ ادبی زندگی میں منٹو نے ۲۷۰ افسانے، ۱۰۰ سے زیادہ ڈرامے، کتنی ہی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے، اور ڈھیروں نامور اور گمنام شخصیات کے خاکے لکھ ڈالے۔ ۲۰ افسانے تو انھوں نے صرف ۲۰ دنوں میں اخبارات کے دفاتر میں بیٹھ کر لکھے۔ ان کے افسانے ادبی دنیا میں تہلکہ مچادیتے تھے۔ ان پر کئی بار فحش نگاری کے مقدمات چلے اور پاکستان میں ۳ مہینے کی قید اور ۳۰۰ جرمانہ بھی ہوا۔ پھر اسی پاکستان نے ان کے مرنے کے بعد ان کو ملک کے سب سے بڑے سویلین ایوارڈ ''نشان امتیاز'' سے نوازا۔ جن افسانوں کو فحش قرار دے کر ان پر مقدمے چلے ان میں سے بس کوئی ایک بھی منٹو کو زندہ و جاوید بنانے کے لیے کافی تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ بقول وارث علوی ''منٹو کی بے لاگ اور سفّاک حقیقت نگاری

نے بے شمار عقائد، مسلمات اور تصورات کو توڑا اور ہمیشہ شعلہ حیات کو برہنہ انگلیوں سے چھونے کی جرأت کی۔ منٹو نے خیالی کرداروں کے بجائے سماج کے ہر طبقے اور ہر طرح کے انسانوں کی رنگارنگ زندگیوں کو، ان کی نفسیاتی اور جذباتی تہہ داریوں کے ساتھ، اپنے افسانوں میں منتقل کرتے ہوئے معاشرہ کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کیا۔

سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو لدھیانہ کے قصبہ سمرالہ کے ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی غلام حسین تھا اور وہ پیشہ سے جج تھے۔ منٹو بچپن میں شریر اور تعلیم کی طرف سے بے پرواہ تھے۔ میٹرک میں دوبار فیل ہونے کے بعد تھرڈ ڈویژن میں امتحان پاس کیا۔ وہ اردو میں فیل ہو جاتے تھے۔ باپ کی سخت گیری نے ان کے اندر بغاوت کا جذبہ پیدا کیا۔ اسکول کے دنوں میں ان کا محبوب مشغلہ افواہیں پھیلانا اور لوگوں کو بے وقوف بنانا تھا مثلاً ''میرا فاونٹن پین، گدھے کے سینگ سے بنا ہے''، ''لاہور کی ٹریفک پولیس کو برف کے کوٹ پہنائے جا رہے ہیں'' یا ''تاج محل امریکہ والوں نے خرید لیا ہے اور مشینوں سے اکھاڑ کر اسے امریکہ لے جائیں گے''۔ میٹرک کے بعد انھیں علی گڑھ بھیجا گیا لیکن وہاں سے یہ کہہ کر نکال دیا گیا کہ ان کو دق کی بیماری ہے۔ واپس آ کر انھوں نے امرتسر میں، جہاں ان کا اصل مکان تھا ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ پڑھتے کم اور آوارہ گردی زیادہ کرتے۔ ایک رئیس زادے نے شراب سے تعارف کرایا اور موصوف کو جوئے کا بھی چسکا لگ گیا۔ شراب کے سوا، جس نے ان کی جان لے کر ہی چھوڑا، منٹو زیادہ دن کوئی شوق نہیں پالتے تھے۔ طبیعت میں اضطراب تھا۔ خلق کے پہلے شمارے میں منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ ''تماشہ'' شائع ہوا۔

ان کو پہلی ملازمت ہفتہ وار پارس میں ملی، تنخواہ ۴۰ روپے ماہوار تھی لیکن مہینہ میں مشکل سے دس پندرہ روپے ہی ملتے تھے۔ اس کے بعد منٹو نذیر لدھیانوی کے ہفتہ وار مصور کے ایڈیٹر بن گئے۔ ان ہی دنوں انھوں نے ''ہمایوں'' اور ''عالمگیر'' کے روسی ادب نمبر مرتب کئے۔ کچھ دنوں بعد منٹو فلم کمپنیوں، ''امپیریل''

اور ''سروج'' میں تھوڑے تھوڑے دن کام کرنے کے بعد ''سنے ٹون'' میں ۱۰۰ روپے ماہ وار پر ملازم ہوئے اور اسی ملازمت کے بل بوتے پر ان کا نکاح ایک کشمیری لڑکی صفیہ سے ہو گیا جس کو انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ ان کو ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت مل گئی۔ یہاں منٹو نے ریڈیو کے لئے ۱۰۰ سے زائد ڈرامے لکھے۔

منٹو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے

پاکستان پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد ان کی کہانی ''ٹھنڈا گوشت'' پر فحاشی کا الزام لگا اور منٹو کو ۳ ماہ کی قید اور ۳۰۰ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ سزا کے خلاف پاکستان کے ادبی حلقوں سے کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ اُلٹا کچھ لوگ خوش ہوئے کہ اب دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے پہلے بھی ان پر اسی الزام میں کئی مقدمے چل چکے تھے لیکن منٹو سب میں بچ جاتے تھے۔ سزا کے بعد منٹو کا دماغ ٹھیک تو نہیں ہوا، سچ مچ خراب ہو گیا۔ یار لوگ انھیں پاگل خانے چھوڑ آئے۔ اس بے کسی، ذلت وخواری کے بعد منٹو نے ایک طرح سے زندگی سے ہار مان لی۔ شراب نوشی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ کہانیاں بیچنے کے سوا نہیں تھا۔ اخبار والے ۲۰ روپے دے کر اور سامنے بٹھا کر کہانیاں لکھواتے۔ خبریں ملتیں کہ ہر شناسا اور غیر شناسا سے شراب کے لیے پیسے مانگتے ہیں۔ بچی کو ٹائیفائڈ ہو گیا، بخار میں تپ رہی تھی۔ گھر میں دوا کے لیے پیسے نہیں تھے بیوی پڑوسی سے ادھار مانگ کر پیسے لائیں اور ان کو دیئے کہ دوا لے آئیں وہ دوا کے بجائے اپنی بوتل لے کر آ گئے۔ صحت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی لیکن شراب چھوڑنا تو دور، کم بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ شائد مر ہی جانا چاہتے تھے۔

کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینہ میں افسانہ نگاری کے سارے اسرار ورموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔

منٹو کی فنی خصوصیات سب سے جدا ہیں۔ انھوں نے افسانے کو حقیقت اور زندگی سے بالکل قریب کر دیا۔ اور اسے خاص پہلوؤں اور زاویوں سے قاری تک پہنچایا۔ عوام کو ہی کردار بنایا اور عوام ہی کے انداز میں عوام کی باتیں کیں۔ اس افسانہ میں نقل مکانی کے کرب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جہاں ہر چیز کا تبادلہ ہو رہا تھا، وہیں قیدیوں اور پاگلوں کو بھی منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ کہانی بشن سنگھ اور کچھ اور پاگلوں کی ہے جو لاہور مینٹل ایسائلم میں رہتے ہیں۔ کہانی دو یا تین سال بعد تقسیم کے بعد شروع ہوتی ہے۔ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے پاگلوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں تبدیل کریں گے۔ بھارت کے مسلمانوں کو پاکستان بھیجا جائے گا اور پاکستان کے ہندو اور سکھوں کو بھارت بھیجا جائے گا۔ جب ان پاگلوں کو اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بالکل الٹ پلٹ ہو گئے کیوں کہ ان کو پاکستان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ انھیں اس کے مقام کا علم نہیں تھا اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ بھارت میں ہیں یا پاکستان میں ہیں۔ ان میں سے ایک پاگل ایک درخت پر چڑھ گیا، اور وہاں رہنے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ نہ وہ پاکستان جائے گا اور نہ ہی بھارت۔ دوسرا پاگل جس کا نام محمد علی تھا، اس نے اپنے آپ کو جناح کہنا شروع کیا اور ایک سکھ پاگل ہے، جس نے خود کو ماسٹر تارا سنگھ کہا۔ لاہور کا ایک جوان ہندو وکیل چاہتا تھا کہ وہ بھارت نہ جائے۔ بشن سنگھ لاہور ایسائلم کے پاگلوں میں سے ایک ہے۔ وہ ایک بے ضرر بوڑھا آدمی ہے جو پندرہ سال پہلے پاگل ہو گیا تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اس کا آبائی علاقہ ہے جہاں اس کی زمین اور جائیداد تھی۔ اس کی فیملی والے ایک ماہ میں ایک بار اس کو دیکھنے آتے تھے، لیکن جب دنگے شروع ہوئے تو انھوں نے آنا بند کر دیا۔ بعد میں فضل الدین، بشن سنگھ کی فیملی کے ایک دوست اور پڑوسی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ بشن سنگھ کی فیملی بھارت روانہ ہو گئی اور وہاں محفوظ تھی۔

آخر کار، تبادلے کا دن آ گیا اور پاگلوں کو واہگہ بارڈر لے جایا گیا۔ سب کچھ مکمل ہونے کے بعد تبادلے کا

عمل شروع ہوا لیکن یہ بہت مشکل کام ثابت ہوا۔ پاگلوں کو قابو میں رکھنا ناممکن تھا، وہ چلاتے بھاگتے، ہنستے، روتے، یہاں اور وہاں بھاگتے اور کام کو مزید پیچیدہ بنا رہے تھے۔ بہت سارے پاگلوں کے بعد بشن سنگھ کی باری تھی کہ وہ تبادلے کے لیے درج کروائیں، وہ وہاں بھی پوچھتا ہے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ بھارت میں ہے یا پاکستان میں؟''۔ بشن سنگھ پاگل کو صرف اس بات سے سروکار ہے کہ اسے اس کی جگہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے جدا نہ کیا جائے۔ وہ جگہ خواہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں۔ جب اسے جبراً وہاں سے نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ایک ایسی جگہ جم کر کھڑا ہو جاتا ہے جو نہ ہندوستان کا حصّہ ہے اور نہ پاکستان کا اور اسی جگہ پر ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ اوندھے مُنھ گر کر مر جاتا ہے۔

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ منٹو کو ذہنی صحت کے مسائل تھے، جو بے شک اس کے کام پر اثر ڈالتے ہوں گے۔ منٹو کی بچپن کی خاصیت اس کے باپ کے ساتھ مشکل تعلّق سے متعلق تھی، جو منٹو کے اٹھارہ سال کے ہونے پر وفات پا گئے۔ منٹو بار بار طنز کرنے والے باپ سے خوفزدہ تھے، کبھی کبھار اس سے بچنے کے لیے چھت سے کُود جاتے تھے۔ منٹو کے باپ کی پہلی بیوی عقلی استحکام کی بیماری کی وجہ سے متاثر ہوئی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ یہ اصل میں اس کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہوا ہو، اور منٹو کو بھی اسی طرح کے دباؤ کا سامنا ہوا ہو۔ نیز جان بوجھ کر اسے منٹو کے باپ کے خاندان نے حقارت کا نشانہ بنایا، جو عائشہ جلال کے مطابق، منٹو کے دل میں گہرے جذباتی داغ چھوڑ گیا۔

ہاشمی نے دعویٰ کیا ہے کہ منٹو کے تخلیقی کام کا اظہار اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے طور پر موت کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ بھی ہو، منٹو پر واضح تھا کہ جوش پیدا کرنے والی شراب اسے قتل کر رہی تھی۔ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں لکھا تھا کہ ''اس خوفناک شے کو پینے والا شخص ایک سال سے کم عرصہ میں پاتال میں منتقل ہو جاتا ہے۔''۔ ان کے بھتیجے حامد جلال کے مطابق، منٹو ممکن ہے ''خودکشی کے خیالی تصوّر کے ساتھ کھیل رہے

تھے، یا تو اس لیے کہ یہ سب سے آسان راستہ تھا یا پھر اس لیے کہ اس ناامید صورتحال کی بنا پر خاندان کو پشیمانی سے بھر دینا چاہتے تھے۔

بِشن سنگھ کا کردار تقسیم کے ہولناک نتائج پر علامتی تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی شدید مصیبت تقسیم کے پناہ گزینوں کی مصیبت کی عکاسی کرتی ہے۔ شاید اس کا کردار منٹو کے خودکشی کے ساتھ ساتھ اس کی مشکل کا اظہار بھی ہو سکتا ہے، جب وہ لاہور منتقل ہونے کے بعد شناخت کی الجھن کا شکار تھے۔ منٹو نے لکھا: ''میرے خیالات بکھر گئے تھے۔ کتنی بھی کوشش کروں، میں نہیں کر سکا کہ بھارت کو پاکستان سے الگ کروں اور پاکستان کو بھارت سے الگ کروں۔'' دوسری جگہ وہ یہ بھی کہتے ہیں: ''میں نے یہ جاننا مشکل پایا کہ دونوں ممالک میں سے اب کونسا میرا وطن ہے''۔ اس طرح، بشن سنگھ کے کردار کو منٹو کی خود شخصی تجربے کی بھی ایک مشابہت کی تصویر کے طور پر پڑھا جائے۔

منٹو کی کہانیوں میں صرف ایک مثال تھی۔ مثلاً ''کھول دو'' میں منٹو نے کردار سکینہ کے استحصال کے طور پر بیان کیا ہے جو ریپ کے دکھ کے بعد پیدا ہوئی ہے، جو نہایت متاثر کن ہے۔ دماغی بیماری ایک ادبی موضوع کے طور پر تقسیم پر کام کرنے والے کئی مصنفوں کے یہاں ظاہر ہوتی ہے۔

❁ ❁ ❁

ارفع یٰسین

فیض کی ایک غزل کا مطالعہ

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

ادھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عُذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گُزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

فیض احمد فیض اردو کے نہایت معروف مصنف اور شاعر ہیں۔ فیض ان کا تخلص تھا اور فیض احمد ان کا اصل نام تھا۔ ان کی پیدائش ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں چرچ مشن اسکول سے حاصل کی۔ انھوں نے عربی میں بی۔اے اور ماسٹرز کیا۔ انھوں نے لاہور میں گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں بھی ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔

فیض کی ابتدائی شاعری زیادہ تر محبت اور حُسن کے موضوع پر ہے۔ وہ ''پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن'' کے ابتدائی ارکان میں سے ایک تھے۔ ۱۹۳۶ء میں اس انجمن کا قیام پنجاب میں بھی ممکن ہوا۔ لاہور میں رہتے ہوئے انھوں نے سیاسی حالات اور مشکلات پر بھی شاعری کرنا شروع کر دی۔ ۱۹۴۲ء میں دوسری جنگِ عظیم میں اپنی خدمات سر انجام دینے کے لیے فیض فوج میں بھرتی ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد انھوں نے فوج چھوڑ دی اور پاکستان ٹائمز کے لیے کام کرنے لگے جو کہ ایک اشتراکی انگریزی اخبار تھا۔

فیض انقلابی سوچ کے مالک تھے اور ظلم و ناانصافی کے خلاف لکھنے کے حوالے سے شہرت رکھتے تھے۔ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو ان پر بغاوت کا الزام عائد ہوا اور سیفٹی ایکٹ کے تحت فوجی افسران کے ایک گروہ کے ساتھ ساتھ ان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مقدمہ بعد میں ''راولپنڈی کانسپریسی کیس'' کے نام سے جانا گیا۔ فیض کو اس مقدمے میں سزائے موت سنائی گئی۔ رہا ہونے سے پہلے انھوں نے چار سال قید میں گُزارے۔ ان کی شاعری کی کتابوں میں سے دستِ صبا اور زنداں نامہ قید میں بِیتے ہوئے وقت کے دوران کی یادگار ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہونے والے خون خرابے پر انھوں نے اپنی شاعری میں افسوس کا اظہار کیا۔

ضیاء کی حکومت میں انھیں جلاوطن کر کے لبنان بھیج دیا گیا۔ جدھر وہ لوٹس میگزین کے لیے کام کرنے لگے۔ فیض نے اردو میں شعر و شاعری جاری رکھی اور ۱۹۸۲ء میں وطن واپس آ گئے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو وہ لاہور میں وفات پا گئے۔ ان کی شاعری کو برصغیر میں بے حد پذیرائی حاصل ہے۔ فیض کی شاعری ہمیں ظلم کا

مقابلہ کرنے کی ہمت دیتی ہے۔ ”نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا“ بھی ان کی ایک ایسی ہی غزل ہے۔ یہ غزل ان کی کتاب ”دست تہِ سنگ“ میں شامل ہے۔

غزل کا آغاز فیض یہ کہتے ہوئے کرتے ہیں کہ اپنے ”ناوکِ نیم کش“ یعنی آدھے کھینچے ہوئے تیر مت چلاؤ۔ ان تیروں کو ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ میرا دل ویسے ہی ”ریزہ ریزہ“ یعنی ٹوٹ کر چکنا چُور ہو چکا ہے۔ اور جو ”سنگ“ یعنی پتھر تم پھینک رہے ہو وہ اپنے پاس بچا کر رکھو کیوں کہ میرا زخمی جسم ویسے ہی برباد اور ضائع ہو چکا ہے۔ وہ مزید ظلم کرنے پر قائل دشمن کو کہہ رہے ہیں کہ اب تو میں اپنی جان کھو بیٹھا ہوں، تمہیں اور ستم ڈھانے اور اپنے وسائل ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔

دراصل فیض پاکستان میں اشتراکی نظام چاہتے تھے لہٰذا وہ اس سے متعلقہ سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ ان سرگرمیوں کے باعث انھیں چار سال جیل میں کاٹنے پڑے۔ اشتراکی نظام کی جدوجہد کے خلاف حکومتیں پُرامن سرگرمیوں پر پُرتشدد پابندیاں لگانے کی عادی تھیں۔ اب شاید فیض ان مظالم سے تھک چکے تھے۔ اس لیے اس شعر میں کہہ رہے ہیں کہ اب مجھ پر مزید ظلم ڈھانے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہو کیوں کہ میں اپنی جان قربان کر چکا ہوں۔

اگلے شعر میں فیض کہہ رہے ہیں کہ میرے ”چارہ گر“ یعنی ساتھیوں کو خوش خبری پہنچا دو اور میرے دشمنوں کو بھی آگاہ کر دو کہ میں نے اپنی زندگی کا قرض اتار دیا ہے یعنی کہ اپنی جان قربان کر دی ہے۔ فیض اس شعر میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کو ایک ساتھ اس لیے مخاطب کرتے ہیں کیوں کہ ان کا مر جانا دونوں کے لیے ہی ایک اہم خبر ہے۔ دشمن کے لیے ان کی موت اس لیے اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ بظاہر ان کا دشمن بغاوت روکنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جب کہ یہ خبر ان کے ساتھیوں کے لیے اہم اس لیے ہے کیوں کہ ان کی نظر میں ان کی جان، جانا ان کا اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی علامت ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ نا

انصافی اور جبر کے حالات میں تماشائی بن کر کھڑے رہیں۔ ان کی نظر میں انصاف اور حق کے لیے لڑنا ہر انسان کا فرض ہے لہٰذا اس محاذ پر جان کھو دینا اپنا فرض ادا کر دینا ہے۔ یہ شعر شاعر کے ان خیر خواہوں کے لیے بھی پیغام ہے جو ان کی سرگرمیوں میں دل چسپی نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی حفاظت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ ان دوستوں کو فیض یہ خوش خبری دے رہے ہیں کہ اب تم لوگ چین پا سکتے ہو۔ اب میرا وجود باقی نہیں رہا کہ تم لوگ میری فکر کرو۔ تم لوگوں کو میری مدد کرنے کے لیے مزید مشکلات اور تناؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

تیسرے شعر میں شاعر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے دفناتے وقت میری ''جبین'' یعنی ماتھے پر کفن کا سر ''کج'' یعنی ٹیڑھا کر کے رکھنا تاکہ میرے دشمن کو ایسا نہ لگے کہ میں موت کے بعد عشق کا غرور بھول چکا ہوں موت کے بعد بھی میری جرأت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ دراصل انگریزوں کی حکومت میں انگریز اپنے سر پر ٹوپی ٹیڑھی کر کے رکھنا غرور اور شان کی علامت سمجھتے تھے۔ لہٰذا فیض کا ماتھے پر کفن ٹیڑھا کر کے رکھنا اس غرور کی علامت ہے جس کی بنیاد عشق پر قائم ہے۔ فیض اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے جوش کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس عشق کے حصول کی راہ میں فخر کے ساتھ رواں دواں رہنا چاہتے ہیں۔ بے شک موت اس سفر کا حصہ ہی کیوں نہ بن جائے۔ وہ موت میں بھی اکڑ اور جرأت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے دشمن کے آگے بھی ڈر محسوس نہیں کرتے۔ اس لیے دشمن کو ایسا نہیں لگنا چاہیے کہ اس نے انھیں عاجز کر دیا ہے۔ ان کا جسم تو بے جان ہو چکا ہے لیکن ان کی روح ابھی بھی زندہ ہے۔

فیض کا کہنا ہے کہ ان کی موت سے ظالم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آئے گی بلکہ اور لوگ اس جنگ کی طرف مائل ہوں گے۔ دشمن نے ان کی دلیری اور جرأت مندی دیکھ کر ان کو قتل کیا تاکہ کہیں انصاف اور حق کی راہ میں آواز اٹھانے کی روایت عام نہ ہو جائے۔ اگر مزید لوگ شاعر کی طرح آواز اٹھانے لگے تو ظلم اور ناانصافی پر قائم پورا نظام تباہ ہونے لگے گا۔ اس لیے وہ انقلابی سوچ شاعر کی زندگی کے

ساتھ ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں لیکن شاعر اپنے کفن کے ٹیڑھے سِرے کے ذریعے دشمن تک یہ پیغام پہنچا رہے ہیں کہ ان کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گا۔

اگلے شعر میں ''اُدھر'' سے شاعر کی مُراد دوسری طرف یعنی ان کے مخالفین ہیں اور ''یہاں'' سے مُراد شاعر خود ہیں۔ اس شعر میں فیض کہتے ہیں کہ جب دشمن کی زبان پہ صرف مجھے مار ڈالنے کا حکم تھا اس وقت میرے پاس اپنے کیے کی لاکھ وجوہات بتانے کے لیے موجود تھیں۔ لیکن میں نے جو بات کہی وہ دشمن نے اَن سنی کر دی اور میں نے جو بات لکھی وہ دشمن نے مٹا دی۔ یہ شعر معاشرے میں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں پر ہونے والے تشدّد پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک ظالم حکومت کے ہوتے ہوئے اگر کوئی جابرانہ نظام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کی آواز دبانے کے لیے اس کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے اور اس کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے تاکہ ظلم کا نظام قائم رہے۔

بے شک احتجاج کرنے والے کتنی ہی ٹھوس بات اور معقول مطالبہ کیوں نہ کر رہے ہوں، ظالم حکمرانوں اور اونچے طبقے کے لوگوں کو اس سے کچھ غرض نہیں۔ وہ اپنے اقتدار کو خطرے میں دیکھ کر بغاوت کرنے والوں کو خاموش کرانا چاہتے ہیں چاہے ان کو اس کے لیے کوئی بھی حد پار کرنا پڑے۔ ایسے ظالموں کو ظلم کی نشاندہی ہونا بھی خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو غافل دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ نا انصافی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ ہر ایسی بات کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے لوگوں میں شعور پیدا ہو۔

آخری شعر میں شاعر کہہ رہے ہیں کہ جب میں کسی بات پر ڈٹ جاتا ہوں تو ''کوہ گراں'' یعنی ایک بھاری پہاڑ کی مانند ہوتا ہوں اور جب میں کسی چیز کی تلاش میں نکل پڑتا ہوں تو اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہوتا ہوں۔ میں ''رہ یار'' یعنی اپنے محبوب تک پہنچنے کا راستہ اپنے ہر قدم کے ساتھ یادگار بنا دیتا ہوں۔ فیض عشق کے سفر میں ثابت قدم اور جانثار ہونے کی تلقین کر رہے ہیں۔ ان کے اس شعر میں وہ غم جاناں اور غم دوراں کو

گھُلا مِلا دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ کسی چیز پر پُر عزم طریقے سے ڈٹ جاتے ہیں تو ان کی طاقت اور ان کا حوصلہ پہاڑ کی طرح وزنی ہوتا ہے۔ اور جب وہ اس چیز کی کھوج میں نکل جاتے ہیں تو اس کے لیے جان دینے سے بھی نہیں گھبراتے۔ یہاں پہ وہ انصاف حاصل کرنے پر ڈٹ جانے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ انصاف کے حصول کے سفر کو محبوب کی راہ سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ثابت قدمی اور جانثاری سے اس راہ کو یادگار بنادیا ہے اور اس راہ پر آئندہ چلنے والے لوگ انھیں مثبت انداز میں یاد کریں گے۔

فیض کی یہ غزل وقت اور جغرافیہ سے بے نیاز ہے۔ یہ ہر زمانے اور ہر جگہ پر ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ فیض کے الفاظ کا چناؤ انسان کے اندر ایک جوش اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے اور حق کے لیے لڑتے رہنے کی ہمت دیتا ہے۔ فیض کا اس جنگ کو عشق کے حصول کی راہ سے تشبیہہ دینا اس سفر کو ایک ہی وقت میں تلخ اور شیریں قرار دینا ہے۔ راستے کی مشکلات تو بہت تلخ ثابت ہوتی ہیں لیکن دل میں موجود جوش اور جذبے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

❁❁❁

صنّان

فیض احمد فیض کی شاعری پر ایک مکالمہ

صنّان: آداب

خانم: آداب و تسلیمات۔ کیا پڑھ رہے ہیں؟

صنّان: بس آغائے فیض کے نسخہ ہائے وفا سے فیض یاب ہونے کی کوشش جاری ہے۔

خانم:

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

صنّان: واہ واہ۔ آقائے غالب کی کیا ہی بات ہے لگتا ہے کہ غالب نے دوسرا جنم فیض کی شکل میں لیا ہے۔ دونوں نے اردو شاعری میں اک نئے دور کی بنیاد رکھی۔

خانم: کچھ سننے والوں کو بھی بتائیں کہ فیض کون تھے۔

صنّان: اردو شاعری کے اک نئے دبستان کے بانی فیض احمد فیض ہیں، جو انیس حلقۂ یاراں بھی ہے اور رفیقِ اہلِ جنوں بھی۔ انھوں نے نہ صرف کوچۂ یار کی رنگا رنگ بزم آرائیاں دیکھیں بلکہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھا کر دار و رسن کو بھی سرخرو کیا۔ جب متاعِ لوح و قلم چھین لی گئی تو فیض احمد فیض نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر اور حلقۂ زنجیر میں زبان رکھ کر لفظوں کو نئے معانی، شاعری کو نیا اسلوب اور نخلستانِ شعر و ادب کو روئیدگی بخشی۔ جو دستِ صبا کو تھام کر سرِ وادیِ سینا اترا تو

غبارِ ایام نے اسے مرے دل مرے مسافر پکارنے پر مجبور کر دیا۔ ہر زمانے میں شعرا اور نثر نگار تو موجود ہوتے ہیں لیکن نمائندہ صرف چند ہوتے ہیں۔ اب ابنِ انشا کا یہ کہنا کسی سند سے کم تو نہیں کہ فیض کا ہر شعر دو نالی بندوق کی مانند ہے۔ ایک نالی کوئے یار کی طرف اور دوسری نالی سوئے دار کی طرف جاتی ہے۔ سو ایک ہی نظم یا غزل میں ایسا سبک اختیار کرنا کہ بیک وقت رومانیت کا اظہار بھی ہو جائے تو یہ کسی صاحب کمال ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ سو وہ کام فیض نے کیا ہے۔

خانم: درست آید۔ چلیں اب کچھ فیض ہمیں بھی عطا ہو۔

صنعان: نظم کا عنوان ہے "رنگ ہے دل کا مرے" پچھلے برس اس نظم کو دنیا کی پچاس بہترین نظموں میں شامل کیا گیا تھا۔

صنعان: تم نہ آئے تھے تو ہر اک چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حد نظر راہ گزر راہ گزر تیشہ مئے تیشہ مئے
اور اب تیشہ مئے راہ گزر رنگ فلک
رنگ ہے دل کا مرے خون جگر ہونے تک
چمپئی رنگ کبھی راحت دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعت بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ لہو رنگ شب تار کا رنگ

آسماں راہ گزر تیشہ مئے

کوئی بھیگا ہوا دامن کوئی دکھتی ہوئی رگ

کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ کوئی رت کوئی شے

ایک جگہ پر ٹھہرے

پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے

آسماں حد نظر راہ گزر راہ گزر تیشہ مئے تیشہ مئے

❁ ❁ ❁

منتہا فاطمہ

میری زندگی کی ناقابلِ فراموش شخصیت

یونیورسٹی کے ہاسٹل سے پہلے میں اکثر سوچتی تھی کہ شاید یہاں آکر مجھے بالآخر آزادی ملے گی۔ اپنی مرضی سے سوؤں گی، اپنی مرضی سے اُٹھوں گی، اپنی مرضی کا کھانا کھاؤں گی اور کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔ گھر میں اکثر ابو مجھے دوستوں کے ساتھ باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور اِس بات پر میں اکثر بہت ناراض رہتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ یونیورسٹی جاکر ہی میری اصل زندگی کا آغاز ہو گا جس میں، مَیں سب اپنی مرضی سے کرپاؤں گی۔ میں نے اپنے ذہن میں اِس زندگی کا ایک بہت ہی غیر حقیقی خاکہ بنا رکھا تھا۔ مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ یونیورسٹی کے پہلے دن سے ہی مجھے اپنے گھر اور گھر والوں کی قدر محسوس ہونا شروع ہو جائے گی۔

جوں جوں میری یونیورسٹی شروع ہونے کے دن قریب آرہے تھے، میرے دل میں ایک عجیب سی بے چینی گھر کرنے لگی تھی۔ میرے لیے اس بے چینی کی وجہ سمجھنا مشکل تھا کیوں کہ بظاہر تو میں آزاد ہونے جا رہی تھی۔ مگر شاید میرے دل کو معلوم تھا کہ اپنے گھر والوں کے بغیر کوئی گھر آپ کو گھر نہیں لگتا۔ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ اندر سے میں گھر والوں سے دور جانے پر بہت اُداس تھی لیکن اُس بارے میں سوچنا پسند نہیں کرتی تھی۔

ہاسٹل میں پہلی رات سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگلی صبح میری زندگی مکمل طور پر بدلنے والی ہے۔ اب نہ مجھے کوئی جگانے والا ہو گا، نہ زبردستی ناشتہ کرانے والا۔ نہ ہی کوئی بیماری میں میری تیمارداری کرے گا اور نہ ہی کوئی میرے نخرے اُٹھائے گا۔ کیا یہ واقعی آزادی تھی یا میری تنہائی؟ پوری رات اِن خیالات نے مجھے بے چین

رکھا۔ سفر کی تھکاوٹ اور اُداسی کے باعث میں ایک پل بھی نہ سو سکی۔ اگلے دن جب میری امّی سے بات ہوئی، اُن کی میٹھی آواز مجھے کبھی اُتنی پیاری نہ لگی ہو گی جتنی اُس دن لگی تھی۔ کاش میں نے گھر پر اُن کے ساتھ بتائے ہوئے وقت کی قدر کی ہوتی۔ میں جانتی ہوں کہ اب چار سال تک یہ پچھتاوا میرا پیچھا نہیں چھوڑنے والا۔

گھر پر تو امی مجھے کوئی کام نہ کرنے دیتی تھیں اور یہاں اپنے سب کام مجھے خود کرنے پڑتے ہیں۔ بیماری کی حالت میں بھی کوئی خیال رکھنے والا نہیں ہوتا۔ نہ ناشتہ کرنے کی فرصت ہوتی ہے نہ کھانا کھانے کی۔ مجھے تو یہاں آکر احساس ہوا کہ کالج سے آکر امی کی شکل دیکھنا بھی کتنی بڑی غنیمت تھی، دن کی آدھی تھکان تو ویسے ہی اُتر جایا کرتی تھی۔ گھر والوں کے قریب ہونے سے ہی آدھی پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں۔ کفایت شعاری کی اہمیت بھی مجھے یہاں آکر محسوس ہوئی جب پیسوں کا حساب رکھنا پڑا، ورنہ گھر پر تو جب مانگوں، امی ابو دے دیا کرتے تھے۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی کتنی مہنگی ہیں اِس کا اندازہ بھی مجھے یہاں آکر ہوا۔

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ گھر کا کھانا جسے کھاتے ہوئے میں ایک زمانے میں مُنہ بنایا کرتی تھی، آج مجھے اتنا یاد آئے گا۔ شاید لوگ صحیح ہی کہتے ہیں کہ ماں کے ہاتھ کے کھانے میں باقی اشیاء و اجزاء کے ساتھ ساتھ اُن کی شفقت بھی ملی ہوتی ہے۔ آپ کے گھر اور گھر والوں کا نعم البدل دُنیا کی کوئی طاقت، کوئی آزادی نہیں۔ اگر قدرت مجھے پھر موقع دے تو میں ہاسٹل آنے سے پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ گُزارے ہوئے ہر لمحے کی دل سے قدر کروں گی، مگر وقت بھی تو ایسی ظالم شئے ہے کہ کسی کے لیے نہیں رُکتا۔

❋❋❋

تیمور علی

مشعلِ او جہل

یہ دسمبر کی ایک سرد اور تاریک رات تھی۔ جنگل میں دور دور تک لمبے لمبے درختوں اور خاردار جھاڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک نوجوان کاندھے پر اَشرفیوں کا ایک بڑا تھیلا رکھے جھاڑیوں کو چیرتے ہوئے نمودار ہوا۔ وہ کچھ دیر اپنی سانس بحال کرنے کی نیّت سے ہانپتا ہوا ایک درخت کے سہارے جا کھڑا ہو گیا۔ اُس کی بے چین آنکھیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں کبھی نظر باندھ کر دائیں جانب دیکھتا تو کبھی بائیں۔ حتّٰی کہ اُس کی نظر دُور پہاڑ کی ایک چوٹی پر جلتی مشعل کی طرف اُٹھی اور اُس کے دل میں ایک امید کی کرن جاگی۔ شاید یہ وہی مشعل تھی جسے ڈھونڈنے کے لیے التو اور شمس نے اپنے گاؤں سے میلوں تک کا سفر طے کیا تھا۔

"ملی؟"

پیچھے کھڑے نڈھال التو نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

لیکن شمس تو جیسے مشعل کی روشنی میں گُم ہی ہو گیا تھا۔

"شمس بھاؤ؟" التو نے اُسے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"وہاں پہاڑ کی چوٹی پر کیا دیکھے جا رہے ہو؟ وقت کم ہے جلدی چلو، پتا ہے ناں کہ بابا جی نے کہا تھا۔ سولھویں رات کے بعد مشعل کو ڈھونڈنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا، اگر مُراد پوری کرانی ہے تو ہمیں کل رات سے پہلے پہلے مشعل کے نیچے بنے کنویں میں اشرفیاں ڈال کر دعا کرنا پڑے گی۔"

شمس چونکا؟

''کیا تمھیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا؟'' اس نے التو کو پاس بلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، پر کیا تمھیں دِکھ رہی ہے؟'' التو نے پُر امید آنکھوں سے پوچھا۔ شمس پریشان تھا۔ اُس کے وجدان میں یہ بات ضرور آئی کہ بابا جی نے کہا تھا کہ یہ مشعل صرف نیک اور صاف دل والے انسانوں کو ہی نظر آتی ہے لیکن التو سے زیادہ صاف دل اور نیک انسان کون ہو سکتا ہے۔ پھر التو کو یہ مشعل کیوں دکھائی نہیں دے رہی۔ اُس نے ایسے سوچا۔

''بتاؤنا بھاؤ'' التو نے تجسّس سے اُسے جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

حیرانگی کے عالم میں ڈوبے شمس نے ''نہیں'' میں سر ہلا دیا۔

التو ایک بار پھر سے مایوس ہوا اور تھکن کے مارے اپنا تھیلا وہیں پھینک کر ایک درخت سے کمر جوڑ کر بیٹھ گیا۔

''نہ جانے کون فرشتہ صفت تھے وہ لوگ، جنھیں یہ مشعل نظر آئی، بھاؤ ہم تو ترس گئے ہیں اُس کی ایک جھلک دیکھنے کو۔'' اُس نے مایوسی کے عالم میں کہا۔

''اٹھو التو وقت کم ہے، ہمیں اُس چوٹی تک پہنچنا ہے اگر دیر ہو گئی تو یہاں تک آنے کا کچھ فائدہ نہ ہو گا۔'' شمس نے جوش میں اُس مشعل پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

''نہیں بھاؤ! میں تھک گیا۔ آج ادھر ہی آگ جلاتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔'' شمس کے بہت اصرار کرنے پر بھی التو نہ مانا اور چونکہ گھنے جنگل میں اکیلے جانا خطرے سے خالی نہ تھا، اس لیے شمس کو بھی وہیں رُکنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں نڈھال التو نیند میں ڈوبا خرّاٹے لینے لگا، لیکن شمس نے ساری رات اُس جلتی مشعل کو دیکھتے اور صبح کا انتظار کرتے کاٹ دی۔ کئی بار التو کا تھیلا لے کر اکیلے ہی مشعل کی طرف بھاگ جانے کا سوچا لیکن راستے میں آنے والے خطرات سے آشنا، اُس نے اپنے نفس پر قابو پایا۔ التو کا تھیلا دیکھ اب وہ یہ سوچ رہا تھا، کہ مشعل

تو مجھے ملی ہے تو پھر التو یہاں سے اپنی مراد کیوں پوری کرے۔ مجھے اپنی دو مُرادیں پوری کرنے کا موقع ملنا چاہیے نہ کہ ایک۔ غرض یہ کہ لالچ سے دو چار شمس نے ترغیب سوچی کہ وہ کل تک التو کے ساتھ مشعل کے قریب تک پہنچے گا اور جیسے ہی موقع ملے گا تو التو کی اشرفیاں لے کر بھی فرار ہو جائے گا اور اپنی دونوں مُرادیں پوری کروالے گا۔ اگلے دن دونوں پھر سے سفر کو نکل پڑے، شمس جگہ جگہ جان بوجھ کر ٹھہر جاتا اور موقع کی تلاش میں رہتا۔ حتّٰی کہ رات آ پہنچی۔ شمس نے ایک بار پھر ٹھہرنے کا بہانہ کیا اور اس بار التو کو لکڑیاں لانے کا کہا، التو اپنا تھیلا زمین پر چھوڑے لکڑیاں لینے چلا گیا۔ اتنے میں شمس نے التو کا تھیلا اٹھایا اور اپنی پُوری قوّت سے مشعل کی طرف بھاگنے لگا کچھ ہی دیر کے بعد اُس نے التو کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اُس کی منزل چند قدم ہی دور تھی۔ چہرے پر خوشی کے آثار لیے جب وہ مشعل کے نیچے پہنچا تو بالکل وہی منظر دیکھا جو باباجی نے اُسے بتایا تھا۔ شمس خوشی سے چِلّا اٹھا۔

”جلدی کرو شمس بیٹا“ پیچھے سے ایک بزرگ کی آواز آئی۔

شمس مڑا تو باباجی کو اپنے سامنے پایا۔

انھیں دیکھتے ہی اُن کے پاؤں میں گر پڑا۔

”اُٹھو شمس، میں جانتا تھا کہ تم ہی دل کے وہ صاف انسان ہو گے جسے یہ شمع چُنے گی۔ آگے بڑھو۔ رسم پوری کرو اور اپنی مُرادیں مانگ لو۔“

شمس آگے بڑھا، وہ مشعل کے جتنے قریب جاتا اُس کا چہرہ اُتنا ہی کِھل اٹھتا، کنویں کے قریب جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ساری اشرفیاں بہا دیں۔ رسم کے مطابق اُس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی مراد مانگنے لگا۔ جیسے ہی ایک مراد مانگی، اپنی آنکھوں پر پڑتی روشنی کو اُس نے دُگنا ہوتے محسوس کیا لیکن رسم کی شرائط کے مطابق آنکھیں نہیں کھول سکتا تھا۔ اُس نے دوسری مراد مانگی اور روشنی کا ایک عجیب عالم محسوس کیا۔

اُس کے دل میں خوشی کی ایک ایسی لہر دوڑی کہ آنکھیں کھولنے کو دل ہی نہ چاہا اتنے میں اُسے اپنی چھاتی پر ایک عجیب سا دھچکا محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اسے لات دے ماری ہو۔ اُس کے بعد منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید ہوا اور اس کے بعد لاتوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ جب شمس ہلنے کے بھی قابل نہ رہا تو بابا جی کے ساتھ آئے بڑی بڑی مشعلیں پکڑے بدماشوں میں سے ایک نے اُسے درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ بابا جی کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ اُبھری ''پھینکو اسے کہیں جنگل میں آیا بڑا اصاف دل انسان۔''

''شمس بھاؤ اٹھو! کیا ہو گیا تمہیں! کہاں چلے گئے تھے تم رات کو، اور تمہارا چہرہ اتنا زخمی کیوں ہے۔'' التو نے پوچھا۔

شمس التو کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا لیکن اُس نے جلد بھانپ لیا کہ التو سارے واقعہ سے انجان ہے اُس نے اپنے بچاؤ کے لیے کہانی جڑ دی کہ ''میرے پیچھے ریچھ لگ گیا تھا التو بھائی میں اس سے جان بچانے کے لیے بھاگتے بھاگتے ایک درخت میں جا لگا اور اب تمہارے سامنے ہوں'' مجھے معاف کر دو مجھے کچھ یاد نہیں کہ تمہاری اشرفیاں کہاں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں شمس بھاؤ ویسے بھی تو میں نے مشعل کے بدلے وہ اشرفیاں بہانی ہی تھیں۔ اب مجھے مشعل تو مل گئی ہے تو میں یہی سمجھوں گا کہ میں نے اس مشعل کے بدلے وہ اشرفیاں بہا دیں۔''

''شکریہ بابا جی! میں سمجھ گیا کہ آپ کا ہمیں وہاں اُس جنگل میں بھیجنے کا مقصد کیا تھا۔ جنگل میں جب کچھ وقت کے لیے شمس بھاؤ مجھ سے دور ہو گئے تھے تو میں نے درخت پر بیٹھے دو پرندوں کو سنا۔ وہ اس بات پر افسوس کر رہے تھے کہ آج کا انسان اپنے دل کے اندر کی مشعل کو چھوڑ کر باہر کی دنیا میں مشعل ڈھونڈنے چلا ہے۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے آج کے انسان کو۔ ارے اصل مُرادیں تو دل کی مشعل جلانے سے پُوری ہوتی ہیں۔ بابا جی میں سمجھ گیا کہ آپ نے ہمیں ہمارے دل کی مشعل تلاش کرنے کو بھیجا تھا۔''

التو نے باباجی کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

....

کردار: التو، شمس، باباجی

تھیم: کہانی ایک مشعل کو ڈھونڈنے والے دو مسافروں پر مبنی ہے جو اپنی خواہشات کے حصول کے لیے اس سفر پر نکلتے ہیں ان میں سے ایک للچا کر دوسرے کو چھوڑ دیتا ہے لیکن آخرکار مشعل اُسے ہی ملتی ہے جو دل کا صاف ہے۔

پلاٹ: ایک گھنے جنگل کا منظر۔

❋ ❋ ❋

فاطمہ اسلام

گُتھیاں

رات کے دو بج رہے تھے۔ آسماں پر بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند ان بادلوں کے پیچھے اٹھکیلیاں کر رہا تھا مگر مجھے اس سب سے کوئی خاص سروکار نہ تھا۔ وہ دن اور تھے جب مجھے موسم سے ،ماحول سے دل چسپی تھی۔ دل ان کی طرف مائل ہوتا تھا۔

قلم ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی میں مگر ذہن خالی۔ کچھ چل نہیں رہا تھا۔ جیسے انسان تھک سا گیا ہو بیٹھے بیٹھے ۔مجھے لگتا ایسے ہی ہے کہ قلم اٹھا لیا تو پتہ نہیں کیا کیا لکھ ڈالوں گی، مگر جیسے ہی اٹھاؤ قلم تو سب خالی۔ ایک کالی سکرین دماغ پر اور اس پر مختلف شکلیں۔ لوگ آتے ہیں اور غائب۔ ایسے لگتا ہے جیسے سب گُم گیا ہے اور خود کو ڈھونڈنے کی مہلت بھی نہیں مِلتی۔

ابھی کل کی بات ہے جب میں چھٹی جماعت میں تھی اس وقت جو بھی ہوتا تھا یا کچھ بھی محسوس ہوتا تھا تو بڑا آسان تھا اس کو الفاظ کے پیرائے میں ڈھالنا اور پھر ہلکا پھلکا محسوس کرنا۔ آج میں بی ایس کے آٹھویں سمیسٹر میں ہوں کچھ بھی مکمل اور اچھے سے محسوس ہو تو ہی لکھوں بیان کروں اپنا اندر باہر نکال پھینکوں۔ ایک لحظے کو چیز آئے گی چلی جائے گی یا پھر گہری نیند میں کچھ مجھے جھنجھوڑ کر اٹھائے گا اور چلا جائے گا۔

شاید زندگی کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ کچھ بھی مکمل محسوس کرنا اور پھر اس کو قلم بند کرنا ناممکن سا ہے۔ مجھے مکمل اندازہ بھی نہیں کہ کیا کروں کیا لکھوں کدھر سے شروع کروں کہاں ختم کروں۔ اس سب میں سے کسی چیز کا جواب بھی میرے پاس تو نہیں ہے۔ ایسے ہی میں کون ہوں کیوں ہوں میرے ہونے کا مقصد یا پھر

میرا وجود ہے ہی کیوں مجھے نہیں پتہ۔ مجھے مسلسل اور غیر واضح انداز میں یہ سب محسوس ہوتا ہے یوں بھی نہیں کہ معلوم ہو سکے مگر جان بھی نہ چھوٹے۔

اچانک سے ذہن میں دھماکہ ہوتا ہے کہ میرے پاپا کہاں ہیں ابھی کل تو وہ میرے پاس تھے۔ ساتھ تھے آج کہاں ہیں؟

Why Can't I feel him around me for past four years?

خیال آیا ابھی اور غائب......... بس ذہن میں کچھ نشانات ادھورے سے......... ایسے ہی خیال آتا ہے کہ فلاں انسان ابھی تو میرا اتنا اچھا دوست تھا ابھی اسے کیا ہوا ہے؟ اوہ......... یہ تو ۴ سال پرانی بات ہے مگر دوستی سے اجنبیت کا سفر کیسے طے ہو گیا مجھے نہیں معلوم.........

مجھے خود کو Cover کرنا ہے یہ کیا میں Partial Exposing کپڑے پہن لیتی ہوں یا نہیں مجھے تو نہیں کرنا بالکل موڈ نہیں۔ چادر اوڑھنے کا عجیب طریقہ۔ بڑے بڑے دوپٹے سر کا سیاپا۔ کچھ دن پہلے تک تو شرم سی محسوس ہوتی تھی آج کل نہیں ہوتی مگر پتہ نہیں کیا چلتا ہے......... اللہ ہی جانے۔

میری ماما تو میری Best Friend تھیں۔I was so much attached to her. اب کیا ہوا ہے کچھ بات نہیں ہوتی ان سے۔ ہو بھی تو بس اوپر اوپر سے۔Not feeling a connection اور یہ اوپر سے میرے ساتھ لیٹا لڑکا کون ہے؟ میں جانتی بھی ہوں اس کو یا چلو کیا یہ مجھے جاننا ہے؟ حساب لگاؤ تو ساتھ تو دو چار سالوں سے ہے مگر یہ فاصلہ سا کیوں ہے ایک دوسرے کو سمجھتے سمجھاتے تو رہتے ہیں مگر پھر بھی کبھی یوں لگتا ہے پیدا میرے ساتھ ہوا تھا مگر میں اس کو جانتی تو نہیں.........

یار یہ عورتیں بھی عجیب سی Complex مخلوق ہیں، مجھے خود کی سمجھ نہیں آتی کسی کی کیا آئے گی؟ ساری زندگی اس لیے پڑھا کہ قابل ہو جاؤں خود کے لیے کافی ہو سکوں مگر اب مجھے Independent ہونا ہی

نہیں۔ مجھے کسی مرد پر dependent ہی رہنا ہے مجھے کیا پڑی کماؤں دوہری ذمہ داری میں پڑوں۔ مگر مجھے دنیا بھی گھومنی ہے خواب پورے کرنے ہیں تو پھر میں خود ہی یہ سب کر لوں گی۔ کسی کی کیا ضرورت؟ ویسے ہم انسان بھی کتنا چھوٹا سوچتے ہیں تا کہ میرے خواب میرا یہ میں وہ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ کیا بات ہوئی زندگی کا کوئی مقصد ہوتا ہے کوئی Bigger Picture ہوتی ہے۔ دنیا میں بس میں خود کے لیے آئی ہوں کیا؟ مجھے سوسائٹی کے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔ Education Sector میں Serve کرنا ہے۔ سی ایس ایس کو کلیئر کر کے سکول کالج کے بچوں کے لیے کام کرنے ہیں جو غلطیاں مجھ سے ہوئیں ان سے باقی بچوں کو بچانا ہے ان کو بتانا ہے کہ کب کون سا کام کرتے ہیں۔

سب کچھ چھوڑو تھوڑا وقت پہلے تو میرا اللہ تعالیٰ سے اتنا گہرا تعلق تھا نماز چھوڑنے کو دل نہ کرتا تھا بلکہ نفلی عبادات بھی کر لیتے تھے ابھی پتہ نہیں کیا مسئلہ ہوا ہے پتہ نہیں میرا اس Super Power کے ساتھ Connection کیوں ختم ہو گیا ہے یا پھر ?Does that super power exists any were۔ اوپر سے دنیا میں بھی پتہ نہیں کیا ہو تا رہا ہے اور ہو رہا ہے سمجھ میں آ نہیں رہا کہ انسان انسان کو ہی کیسے مار رہا ہے، میرا تو جسم کانپتا ہے کہ دنیا جا کس طرف کو رہی ہے؟

اور عجیب بات ہے کہ یہ زندگی اتنی لمبی کیوں ہے مختصر سی کیوں نہیں۔ ۲۰، ۲۲ سال بڑے ہوتے ہیں امتحان کے عجیب سی مصیبت ہے زندہ رہنا بڑی ذمہ داری ہے۔ اور ایک دن میں نے بھی مر جانا ہے اور مجھے وہ ایک دن پتہ بھی نہیں ہے؟ ٹھیک تو ہے زندگی۔ ایویں مر جائیں؟ پتہ نہیں چاہتے کیا ہیں سب خدا سمیت؟

بی ایس کر کے کیا کرنا ہے آگے؟ Career بھی عجیب ہی مسئلہ ہے۔ باہر کی یونیورسٹیوں میں apply کر تو دیا ہے ہو گیا تو ٹھیک نہ ہوا تو؟ تو شاید Research Assistant لگ جائیں پھر.........

زندگی کتنی پیاری سی ہے اور یہ دنیا بھی اتنے پیارے پہاڑ، پھول، پودے درخت، چاند، ستارے

Everything is worth seeing and worth living. اچانک سے خیال آتا ہے یار مجھے تو بی ایس کے بعد ایک اور Undergrad بھی کرنا ہے۔ Psychiatrist بننا ہے نا۔ وہ الگ بات ہے کہ ہو یہ Degree بھی نہیں رہی۔

یہی سب کچھ اور اسی طرح کا بہت کچھ سینکڑوں منتشر سوچیں چلتی رہتی ہیں بظاہر تو زندگی بڑی Set ہے کہ کُڑی LUMS وچ پڑھدی ہے؟ ہیں اچھا! ماشاء اللہ جوان وی ہو گئی اے۔ ایہد اویاہ وی کرنا ہن آپاں، یہ آوازیں بھی کانوں میں آئیں اور پھر غائب۔ ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ سی ہے جاتی پتہ نہیں کیوں نہیں.........؟

خیر کیا فرق پڑتا ہے؟ صبح ہو گئی ہے Bag اٹھاؤ یونیورسٹی جاؤ لیکچر لو ریسرچ کا کام کرو، کھانا کھاؤ چائے پیو۔ دو چار لوگوں سے گفتگو کرو اور سو جاؤ۔ ٹائم نہیں ہے اس بس کو Detail سے سوچنے کا، حل کرنے کا، یہ تو چلتا ہی رہتا ہے، اس کا پتا ہے، جان چھڑواؤ بس۔

مگر یہ بھی تو مسئلہ ہے نا کہ جان چھڑوائے نہ چھوٹے ہر چیز سے بھاگتے ہوئے بھی میں سوچتی ہی کیوں ہوں جتنا دُور جاتی ہوں کچھ نہ کچھ اسی شدت سے بار بار مجھے واپس لا کھڑا کرتا ہے.........

میں بی ایس کے بعد ۴-۵ ماہ کی Break لے کر life کو تھوڑا Sort out کرنے کی کوشش کروں گی کہ ہے کیا یہ......... لیکن فاطمہ!!! آگے کیا کرنا ہے یہ بھی تو سوچو؟ پورا معاشرہ بہت زور سے اس کے کان میں چِلّایا......... تمھیں کوئی حق نہیں خود کے لیے سوچنے کا، رُکنے کا، سانس لینے کا بس لگے رہو ایک System میں۔ سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے، یہ سب تو فضول خیالات ہیں آتے رہیں گے دفعہ کرو۔

لیکن مجھے بہت زیادہ رونا ہے، چیخنا ہے، لکھنا ہے، ایک ایک چیز کھرچ کر اندر سے باہر نکال پھینکنی ہے۔ اور پھر فاطمہ تھکے دماغ اور دل کے ساتھ نارمل زندگی جیسا ایک مزید دن گزارنے کے لیے تیار ہو گئی اور خود سے وعدہ کرنے لگی کہ ایک دن وہ ضرور خود کے لیے وقت نکالے گی اور ضرور دیکھے گی کہ اتنی سب گرہیں الجھنیں

She lost herself?
How she lost focus?
How she lost the connection with herself?

اس جواب کو میں ضرور تلاش کروں گی انشاء اللہ ضرور میرا وعدہ رہا مجھ سے.......... مگر یہ Survival کی جنگ بڑی جنگ ہے..........

❁ ❁ ❁

احمد فراز

سردی کی راتیں

سردی کی راتیں مجھے خوب اچھی لگتی ہیں کیوں کہ کمبل اوڑھ کے سونے سے غضب کی نیند آتی ہے۔ ویسے تو میں اتنا لائق اور وقت کا پابند نہیں ہوں لیکن سورج ڈھلنے سے پہلے خان بابا ٹی اسٹال پر چھ بجے کے قریب اپنی حاضری لگوا دیتا ہوں۔

(ہمدرد) اسلام علیکم۔ ''خدا کی قسم آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔ آپ فوراً پہنچ گئے۔ بڑی لمبی عمر ہے آپ کی (میں نے کہا)۔

ہاں یار فارغ بیٹھا تھا، سوچا ادھر کا رُخ کر لوں۔ گرم چائے کے ساتھ ساتھ سگریٹ کے دھوئیں سے سورج کو خدا حافظ کہہ دوں۔ روح تازہ ہو جائے گی۔ (ہمدرد نے فلسفیانہ انداز میں کہا)۔

''سناؤ کیسی جا رہی ہیں آپ کی کلاسز؟ آپ بہت مصروف لگتے ہو پیپر تو نہیں چل رہے؟

ہمدرد ''ہاں یار بس مڈ ٹرم چل رہے تھے اسی لیے۔ آج کل شاعری کیسی جا رہی ہے آپ کی۔ کر بھی رہے ہیں یا نہیں؟''

''یار شاعری بہت مشکل ہے وزن اور بحر کا خیال رکھنا ہو گا علم قوافی میں ماہر ہونا پڑے گا۔ سوچ رہا ہوں افسانہ نگاری کر لوں۔ مگر اس میں بھی پلاٹ، کلائیمیکس (Climax)، کہانی اور کردار کی ضرورت ہوتی ہے اب بندہ کرے تو کیا کرے۔''

ہمدرد ''یار ہم ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جہاں کرداروں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں کہانی بنانے کے

لیے آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہر روز نئے قصے جنم لیتے ہیں۔ یہاں کردار ڈھونڈنے نہیں پڑتے۔ بس الفاظ کی کمی ہے۔ لکھنے کے لیے تو کچھ بوند سیاہی کی ضرورت ہے۔ (ہمدرد کا لہجہ تیز ہوتا گیا مگر میں نے بات ٹال کر کہا)

"یار یہ سب کہنا آسان ہے لیکن لکھنا مشکل۔ (میں ابھی اپنی بات مکمل نہ کر پایا تھا کہ ہمدرد چل دیا اور میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور کچھ سوچتا رہا)۔ سورج کے ڈوبنے کی آواز میرے کانوں میں ایک گیت کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس دنیا کی ہر چیز آرام کی حالت میں جا رہی ہو۔ میں ایک لمحے کے لیے اتنا کھو گیا کہ جب اچانک میری آنکھ گھڑی پر پڑی تو آٹھ بج چکے تھے۔ میں چائے کے پیسے ادا کر کے اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ سردی میں بھی آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا گیا۔ مُنہ نے چمنی کا روپ دھار لیا اور اس سے نکلنے والا دھواں، سگریٹ کے کسی کش سے کم نہ تھا۔ سڑک پر رش تھا تو میں ایک گلی کی طرف مڑ گیا۔ ٹھنڈ سے میں کانپ رہا تھا اور بار بار میرے مَن میں گرم کمبل آ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں، میں نے ٹھان لیا کہ کمرے میں جا کر فوراً کمبل اوڑھ کے سونا ہے پر اچانک میری نظر درخت کے نیچے سوئے ہوئے شخص پر پڑی جو اتنی ٹھنڈ میں کمبل اوڑھ کے سکون سے سو رہا تھا۔ میں حیران رہ گیا اور سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یا تو یہ شخص بے ہوش پڑا ہے یا پھر مُردہ لاش ہے۔ میں ڈرنے لگا مگر پھر باہمت ہو کر آواز دی۔ "او بھئی سو رہے ہو"

یکدم سے آواز آئی "نہیں مر گیا ہوں کیسے لوگ ہیں سکون سے سونے بھی نہیں دیتے" (اس نے انتہائی سخت لہجے میں جواب دیا)۔

میں پھر سے تیز قدموں کے ساتھ کمرے کی طرف چلا اور پانچ منٹ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ جلدی سے بستر سیدھا کر کے کمبل اوڑھنے لگا کہ اچانک مجھے ہمدرد کی وہ بات یاد آ گئی کہ کرداروں کو بس کہانی میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ تو یہ دنیا کرداروں سے بھری پڑی ہے۔

میرے کمرے کی بند کھڑکی کے چاروں طرف سے ایک سرد ہوا کا جھونکا سمندر کی سرد لہروں کی طرح

میرے بدن سے ٹکرا رہا تھا۔ سرد ہاتھوں سے قلم کو مضبوطی دینا، جنگ میں زخمی ہاتھ سے تلوار کو تھامنے سے کم نہ تھا۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب میرے دماغ میں خیالات کے انبار لگ رہے ہوں۔ میں نے فوراً قلم اٹھایا، کاغذ لیے اور افسانہ لکھنے لگا۔

''سردی کی رات تھی میں ایک سنسان گلی سے گزر رہا تھا.........

ابھی چند فقرے ہی لکھے تھے کہ اس سے آگے میرے خیالات لفظوں کی قید میں نہ آ سکے۔ خیالات دماغ میں تو آ رہے تھے لیکن ہاتھ سے لفظوں میں قید ہونے سے قاصر تھے۔ میں نے قلم کاغذ پر رکھا اور گرم بستر کی طرف اپنے خوابوں کی دنیا میں لوٹنے کے لیے واپس بڑھا۔

صبح دیر تک سوتا رہا جب سورج سر پر آ گیا تو بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ سفید کاغذ پر کچھ لائنیں لکھی ہوئی ہیں۔ جن کا بظاہر مطلب تو نہیں بن رہا۔ لیکن اسے رات والے واقعہ سے جوڑیں تو کچھ سمجھ آتا ہے۔ میں دوبارہ کافی دیر تک اپنے خیالات کو جمع کرتا رہا لیکن کچھ لکھ نہ پایا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا اور اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اسی طرح سورج بھی میرا انتظار کرتے کرتے غروب ہونے کو آ پہنچا۔ آخر کار میں بستر سے اٹھا۔ اور خان بابا ٹی سٹال کی طرف ہو لیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو ہمدرد میرا انتظار کر رہا تھا۔

اسلام علیکم! (میں نے جا کر بلایا اور بنچ کے ایک جانب بیٹھ گیا)۔

ہمدرد۔ وعلیکم السلام! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ اور کسی افسانہ کی طرف اپنی تیاری باندھی یا ابھی تک وزن اور بحر کا مسئلہ چل رہا ہے؟

نہیں یار! رات گئے تک بیٹھا رہا لیکن کچھ لکھ نہ پایا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لفظوں نے میرے خیالات کا ہاتھ روک رکھا ہو اور جو لکھا وہ بھی سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کے مترادف تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ جب تک میں اس سوئے ہوئے آدمی سے وہاں سونے کا مقصد اور اس حال میں ہونے کی وجہ نہ پوچھ لوں، کچھ لکھ نہ پاؤں گا۔ (میں نے

مایوسی بھرے لہجے میں کہا)۔

ہمدرد۔ ''نہیں نہیں۔ اس دنیا میں کوئی تمہیں اپنے دل کا حال کیوں کر بتائے گا۔ میرا یہ ماننا ہے کہ خدا نے کسی کو یہ صلاحیت دی ہی نہیں کہ وہ خدا کے علاوہ کسی مخلوق سے اپنے دل کا حال کہہ سکے۔ اور جو کوئی بھی یہ کرتا ہے وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ اور نہ ہی اسے لکھنا کوئی فائدہ مند عمل ہو گا۔ یہ تو تمہیں دل کی آنکھ سے دیکھنا ہو گا۔ اس دنیا میں ہر شخص ایک زندہ افسانہ ہے۔(اس بار اس کی آواز نرم اور دھیمی تھی)۔

میں نے بھی ہاں میں سر ہلایا اور مزے سے سگریٹ کے کش کا دھواں آسمان کی طرف چھوڑنے لگا۔ ہم کچھ دیر خاموشی سے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ سورج نے اپنا چہرہ ہم سے اوجھل کر لیا۔ میں نے حسبِ معمول ہوٹل اور ہمدرد کو خیر باد کہا اور کمرے کی طرف لپکا۔ اس بار میرے دماغ میں یہ خیال بار بار چل رہا تھا کہ میں ایک افسانہ لکھ پاؤں گا؟ کیا میں ایک افسانہ نگار ہوں؟ میں افسانہ نگار ہوں یا شاعر؟

سڑک پر خاصا رش تھا۔ لیکن اس بار میں نے اسی رستے سے کمرے تک جانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دیکھ سکوں اور اپنے افسانے کے لیے کردار جمع کر سکوں۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ساتھ میں قلم کی جانب لپکا۔ جلدی سے کاغذ اور لکھنے کے لیے ہاتھ کو حرکت دی۔ ابھی چند سطریں اپنے قلم سے اتاری ہی تھیں کہ دوبارہ میرے لفظوں نے میرے خیالات کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور میں وہیں اپنے ماضی والی رات پہ کھڑا تھا۔ اب میرے ہاتھ اور پاؤں سرد ہو رہے تھے میں نہیں جانتا تھا کہ یہ سردی کی وجہ سے ہے یا بے بسی کی وجہ سے۔

کافی دیر سوچنے کے بعد میں نے ہمدرد کی باتوں کو نظر انداز کیا اور اپنی پلکوں سے آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اسی کے ساتھ اپنے خیالات کی دنیا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر ان کے سنگ پھرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت ہی حسین دنیا تھی جس میں لفظ آپ کو اپنا قرض دار نہیں کرتے۔ جہاں لفظ نام ہی نہیں پایا جاتا۔ جو آپ سوچتے ہیں

دوسرے سمجھ جاتے ہیں۔ جہاں آپ آزاد ہیں لفظوں کی قید سے۔ جہاں آپ کو خیالات کے لیے لفظوں کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ وہاں آپ کو سمجھ آتا ہے کہ آپ کس قدر لفظوں کی محتاج دنیا میں اپاہج ہیں۔ اس فرضی دنیا میں بولنے والے سوچنے والوں پر بازی لے جاتے ہیں۔

نہ جانے کیسے کچھ پل کچھ گھنٹوں میں بدل گئے۔ میں نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردے سے آزاد کیا۔ ہاتھ میں قلم تھاما اور اپنے اندر کے شخص کو جسے میں خوب جانتا تھا لکھنا شروع کیا۔ اور لکھتا ہی چلا گیا۔

سردی کی رات تھی.........

❁❁❁

پنجابی

راحم مظہر

لوک داستانیں

لوک داستان اک روایتی کہانی ہوندی اے جو کسے اک زبان دے اندر زبانی طور تے اک نسل توں دوسری نسل تیک منتقل ہوندی اے۔ ایہہ کہانی عام طور تے داستانی شکل وچ سنائی جاؤندی اے تے ایس کہانی دے اخیر وچ کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق وی ضرور ہوندا اے۔

انسان نوں شروع توں ای کہانیاں سناون دی سدّھر رہی اے۔ ہزاراں سال پہلے جدوں اوہ جنگلاں اتے پہاڑاں دیاں ڈونگھیاں غاراں وچ رہندے سن اودوں اوہ کہانیاں توں اِنج ای متاثر ہوندے ہون گے جیس طرح اج اسی ہونے آں۔ داستاناں دا آغاز اودوں شروع ہویا، جدوں انسان تہذیب وتمدن توں بے نیاز ہویا اتے اپنی بہادری دے قصّے، شکار دے قصّے، اتے سفر دے قصّیاں نوں بیان کرن لگا۔ اگر اسی قدیم ترین لوک کہانیاں دا مطالعہ کریے تے ایہہ گل واضح ہو جاوندی اے کہ اوہناں اپنی موجودہ شکل وچ رہن واسطے کئی صدیاں دا سفر طے کیتا اے۔ دنیا دی ہر زبان تے خطے دا لوک ادب مختلف زمانیاں دیاں روایتاں دی پیداوار اے۔ جس نے لاتعداد لوکاں دے جذباتاں نوں اپنے اندر محفوظ کیتا ہویا اے۔ لوک کہانیاں نوں ہر نسل نے دوسری نسل نوں سنا کے ایس نوں نسل در نسل منتقل کیتا اے۔

لوک کہانیاں دے بارے اک غلط فہمی ایہہ ہے کہ ایہہ کہانیاں بے مقصد تے خیالی کہانیاں نیں، اتے حقیقی زندگی نال ایہناں دا کوئی تعلق نہیں ہوندا۔ لوک کہانیاں ہزاراں سالاں پہلے دا ادبی ورثہ ہن جدوں سائنس اتے ادب اجے اپنے ابتدائی دور وچ سن۔ ایس واسطے ایہناں کہانیاں نوں فرضی، غیر حقیقی یا بے مقصد

کہہ کے مسترد نہیں کیتا جا سکدا۔ ایہہ گل سچ ہے کہ ایہہ کہانیاں اوس ویلے دی تاریخ یا معاشرے دے بارے بہت چیزاں بارے دسدیاں نیں۔ کوئی وی شخص لوک کہانیاں وچوں تاریخ نوں تھوڑا بہت ویکھ سکدا اے کیوں جے بہت ساریاں لوک کہانیاں تاریخ دے قصیاں نوں بیان کردیاں نیں۔ جس طرح تاریخ وچ اک لوک داستان ''حضرت یوسفؑ تے اوہناں دے بھرا'' سانوں ملدی اے۔ جیہدے وچ حضرت یوسفؑ دا سارا قصّہ بیان کیتا گیا اے۔ اوس داستان وچوں کجھ سطراں سانوں سارے قصّے بارے دسدیاں نیں۔

> ''یوسفؑ نے اک خواب ویکھیا کہ کجھ ستارے اوہناں دے سامنے جھکدے نیں تے اوہ چمکدے چن دی طرح اوہناں ستاریاں دے وچ نیں۔ اگلی صبح حضرت یوسفؑ اپنے والد دے کول گئے تے اوہناں نوں سارا خواب سنایا جو اوہناں نے کل راتیں ویکھیا سی۔ حضرت یعقوبؑ نے بہت خوش ہو کے اوہناں نوں خواب دی تعبیر دسی کہ اوہ اک دن وڈے حکمران تے بادشاہ بنن گے۔''

لوک کہانیاں دے کرداراں وچ اوہ لوگ شامل ہن جیہناں پہاڑاں نوں اپنی ہتھیلی تے چُکیا، اوہ لوگ جیہناں زمین نوں لت مار کے ایہدے وچوں پانی کڈھیا تے ایس دے نال ملدے جُلدے کرداراں دے بارے لوک داستاناں وی سانوں ملدیاں نیں۔ ایس توں علاوہ اچھے تے ظالم راجے، خوبصورت کُڑیاں دا پچھا کرن والے شہزادے، خطرناک جنگلاں وچ پھنسے ہوئے بہادر، اسماناں تے اترن والیاں پریاں، جنات دے قصّے، سونے دے محل تے ددھ دیاں نہراں ایہو جیہے سارے قصّے وی سانوں لوک داستاناں وچ ملدے نیں۔

لوک کہانیاں وچ نا صرف سانوں رومانوی تے خیالی موضوعات ملدے نیں ایہدے وچ سانوں قدیم لوکاں دے نظریے، اوہناں دے خیالات، روایتاں، رسم و رواج دے بارے وی علم حاصل ہوندا اے۔ اج دے دور وچ جو اسی ناول مختصر کہانیاں تے ادب دیاں ساری صنفاں نوں ویکھدے تے پڑھنے آں ایہہ کتے نہ

کتے لوک کہانیاں دے مرہون منت ہن۔ لوک کہانیاں دیاں صنفاں بارے گل کریے تے سانوں کجھ صنفاں جو زیادہ ویکھن نوں ملدیاں نیں اوہ ایہہ نیں:

- جانوراں دیاں داستاناں
- پریاں دیاں داستاناں
- افسانوی داستاناں
- تاریخی داستاناں

جانوراں دیاں کہانیاں اوہ لوک داستاناں ہن جیہناں وچ جانوراں نوں اہم کردار بنایا جاوندا اے۔ ایہہ کہانیاں زیادہ تر بچیاں نوں اخلاقی سبق سکھاون واسطے یا قدرتی مظاہر دی تفصیل نوں بیان کرن واسطے استعمال کیتیاں جاندیاں نیں۔ جیویں کہ "چالاک خرگوش تے بے وقوف شیر" جیہدے وچ بچیاں نوں ذہانت تے عقل دی قدر کرنا سکھایا جاندا اے۔

دوجی صنف اے پریاں دیاں کہانیاں۔ جیہناں وچ اکثر جادوئی عناصر تے مافوق الفطرت مخلوقات شامل ہوندیاں نیں۔ ایہہ کہانیاں پریاں دے قصّیاں نوں بڑی دل چسپی نال بیان کردیاں نیں۔ ایہناں کہانیاں وچ پریاں دی خوبصورتی نوں اہم مقام دتا جاندا اے تے ایہہ داستاناں سنن والیاں نوں خوش کرن لئی استعمال کیتیاں جاندیاں نیں۔

افسانوی کہانیاں ایہو جیہیاں کہانیاں ہوندیاں نیں جیہناں وچ کائنات، دیوتا تے دوجی مافوق الفطرت مخلوقاں دی ابتداء دی کہانی بیان کیتی جاندی اے۔ ایہہ کہانیاں اکثر مذہبی یا روحانی سبق سکھاون لئی سنائیاں جاندیاں نیں تے ایہہ پنجابی ثقافت دا اک اہم حصّہ وی ہن۔

تاریخی کہانیاں اوہ داستاناں ہن جیہدے وچ پنجاب تے اوس دے لوکاں دی تاریخ بیان کیتی گئی ہوندی اے۔ ایہناں داستاناں وچ اکثر افسانوی ہیرو یا تاریخی شخصیات شامل ہوندیاں نیں۔ ایہہ کہانیاں پنجابی ثقافت تے تاریخ وچ فخر دا احساس پیدا کرن واسطے استعمال ہوندیاں نیں۔

لوک داستاناں اپنی اک خاص پہچان دی وجہ توں ہر علاقے تے ہر خطے وچ مشہور ہوندیاں نیں۔ ہر خطے دیاں اپنیاں لوک داستاناں ہوندیاں نیں۔ جیہدے وچ اوس خطّے دے لوکاں بارے اوہناں دی تاریخ بارے ذکر کیتا جاوندا اے۔ پنجاب جو کہ پنج دریاواں دی سر زمین اے تے اپنی مثال آپ اے۔ لوک داستاناں دی وجہ توں وی بہت مشہور اے تے پنجاب دیاں لوک داستاناں نوں ہر خطے وچ سنیا جاندا اے۔ پنجاب دیاں کجھ مشہور لوک داستاناں ایہہ نیں:

ڈھولا مارو

پنجابی دی اک مشہور لوک داستان اے جیہدے وچ پنجاب دے دو عاشق ڈھولا تے مارو دے پیار دی داستان بارے بیان کیتا گیا اے۔

پورن بھگت

پنجابی دی اک اوہ داستان اے جیہدے وچ پورن بھگت دی زندگی تے اوس توں حاصل ہون والے سبق دے بارے بیان کیتا گیا اے۔

راجا رسالو

داستان جو راجا رسالو دی بہادری تے قوت دی صفت نوں بیان کردی اے تے ایہہ وی پنجابی دیاں لوک داستاناں وچ شمار ہوندی اے۔

سسی پنوں

ایہہ داستان سسی تے پنوں دی عاشقی بارے اے جیہناں دی قسمت اوہناں دے عشق دے سامنے آگئی تے ایہہ وی پنجابی دی اک مشہور لوک داستان اے۔ پنجاب دیاں کجھ لوک داستاناں بہت مشہور ہوئیاں جیہدے وچ ہیر رانجھا، مرزا صاحباں تے سوہنی مہینوال وی شامل نیں۔ لوک داستان ہیر رانجھا وچ رانجھے دا تعلق ضلع سرگودھے دے اک مشہور قصبے تخت ہزارہ توں سی۔ رانجھا اک معزّز زمیندار چودھری موجو دا سب توں چھوٹا پُتر دھیدو سی جیہڑا بعد وچ رانجھا کہلایا۔ رانجھے دی ملاقات ہیر نال دریائے چناب دے کنارے ہوئی سی جس توں بعد اوہناں دی عشق دی کہانی دا آغاز ہویا سی۔

"۱۔اک تخت ہزاریوں گل کیجے جتھے رانجھیاں رنگ مچایا ہے
۲۔ چھیل گھبرو وست اوبیڑے نیں، سُندر اک تھیں اک سوایا ہے
۳۔والے 'کوکلے' مندرے مجھ لنگی، نواں ٹھاٹھ تے ٹھاٹھ چڑھایا ہے
۴۔ کہی صفت ہزارے دی آکھ سکاں گویا بہشت زمین تے آیا ہے"

رانجھے دے باپ دا اپنے علاقے وچ بہت نام سی تے اوہ بہت عزت دار انسان سی۔

"۱۔موجو چودھری پنڈ دی پاہندھ والا چنگا بھائیاں دا سردار آہا
۲۔پُتر اٹھ دو بیٹیاں تسدیاں سن وڈا ٹبّر اتے پروار آہا"

جدوں ایہہ گل ہیر دے ماں پیو نوں پتا چلی تے اوہناں ہیر دا نکاح رنگ پور دے رئیس دے بیٹے دے نال کر دتا، جس دا ناں سیّدا سی۔ رانجھے نوں جدوں ایس گل دا علم ہویا تے اوہ مایوس ہو کے واپس چلا گیا تے گورو بالناتھ دے کول جوگ لینے دی غرض نال چلا گیا۔ گورو دی دعا نال اوس وچ کجھ روحانی صفات وی پیدا ہو گئیاں تے اوہ فقیر بن کے ہیر دے در جا وِنجھیا۔ ہیر دی نند دوہاں دی رازدار بن گئی تے اک دن اوہدی مدد

دے نال دوویں بھج گئے مگر قسمت دے مارے ہیر دے رشتے داراں نے اوہناں نوں پکڑ لیا، پر ہیر نے واپس جان توں انکار کر دتا۔

"۱۔ لے وے رانجھیا واہ میں لا تھکی ساڈے وس تھیں گل بے وس ہوئی
۲۔ قاضی ماپیاں ظالماں بنھ ٹوری ساڈی تینڈڑی دوستی بس ہوئی
۳۔ گھر کھیڑیاں دے نہیں وسناں میں، ساڈی اوہناں دے نال خرخس ہوئی"

قاضی نے ہیر دی بد دعاتوں ڈر کے اوہنوں رانجھے دے حوالے کر دتا۔ ہیر دے ماپیاں نے رانجھے نوں بارات لے کے آن تے باقاعدہ ہیر نوں ویاہ کے لے جاون دا کہیا۔ رانجھا جدوں گھر بارات لین واسطے واپس گیا تے پچھوں ہیر نوں اوہدے ماپیاں بدنامی دے ڈر توں زہر دے کے مار دتا۔ رانجھے نے جدوں ایہہ خبر سنی تے اوہ وی سب کجھ چھڈ کے ہیر دی قبر تے چلا گیا تے اوتھے جا کے اوس نے اپنی جان دے دتی۔

ایہہ لوک داستان پنجابی دی اک مشہور داستان اے، جس دے بارے پنجاب دے لوکاں نوں بڑی اچھی تے سچی طرح علم اے تے پنجاب دے علاوہ وی ایس دی مقبولیت اے۔

پنجابی دی لوک داستان مرزا صاحباں وی اپنی مثال آپ اے۔

مرزا دانا باد، ضلع شیخوپورہ دے کھرلاں دے قبیلے دے سردار دا پتر سی۔ مرزا بہت خوبصورت نوجوان سی تے اوس دی خوبصورتی بہت مشہور سی۔

ماہنی کھرل قدیم تھیں وڈے ساکاں نال
مرزا نِکڑا ہوندا پیار نال پلیا گھر ننھیال
اس دی صورت اتے حُسن دا آہا روپ کمال
دیکھ سیالیں اوس نوں ہو ہو پون نہال

مرزا بچپن وچ کھیوے اپنے ننھیال آ گیا سی۔ اوس دی ماں ماہنی سیال کھیوا خان دی بھین سی۔ صاحباں کھیوا خان دی دھی سی۔ مرزا تے صاحباں مکتب وچ اکٹھے پڑھدے سن۔ اک ہی جگہ تے پڑھدیاں ہویاں دوہاں نوں آپس وچ پیار ہو گیا تے ایتھوں ایہناں دی کہانی دا آغاز ہوندا اے جو کہ بعد وچ بہت دُکھ بھری کہانی وچ بدل گئی۔

صاحباں چوری مرزے کھرل ول دی کرے نگاہ
نین وچولے دوہاں دے دیون گھڑت سنا
عشق کمایئے حال میں ہوون نین گواہ
ککھیں اگ چھپایئے آخر بھڑکے بھاہ

صاحباں دے والد نوں جدوں ایہہ گل پتا لگی تے اوس نے صاحباں نوں مکتب توں ہٹا لیا تے اوس دی منگنی چدّھڑ قبیلے دے اک نوجوان طاہر خاں دے نال کر دتی۔ تے مرزے نوں واپس اوس دے گھر بھیج دتا۔ مرزا واپس آ کے صاحباں دے فراق وچ وقت گُزارن لگا۔ اک دن اوہنوں صاحباں دی بارات دا پیغام آیا تے اوہ تیر کمان اٹھائے اپنی گھوڑی تے سوار ہو کے کھیوے ول روانہ ہو گیا۔ اوسے پنڈ وچ اوس دی پھُپھی بیبو رہندی سی۔ مرزا اوتھے آ کے اوس دے گھر ٹھہریا۔

اگے خط لکھنی ایں بھج کے جٹ بوہے بیٹھا ای آ
اوس پندھ ساندل دا چیریا جتھے خوف خطر دا راہ
اوہ بدھا تیرے قول دا موتوں بے پرواہ
میں گھلی تیرے مرزے یار دی کجھ مونہوں آکھ سنا

اوتھے اوہنے ایہناں دوہاں دی ملاقات کرائی تے اوتھے اوہناں نے ایہہ طے کیتا کہ مرزا صاحباں نوں

لے کے نس جاوے گا۔ مرزا شادی دی رات دیوار ٹپ کے صاحباں نوں لے کے فرار ہو گیا مگر کئی راتاں دا جاگیا مرزا تھک کے رستے وچ اک جنڈ دے درخت دے تھلے لیٹ کے سوں گیا۔ صاحباں نے ایس ڈر توں کہ اوس دے ماں باپ اوس نوں لبھ لین گے مرزے نوں جگایا تے کہیا جو اوس نوں اگے لے چلے۔ مرزے نے اوہنوں جواب دتا کہ اوہ کسے کولوں نہیں ڈردا تے اگر کسے اوس توں صاحباں نوں کھوہن دی کوشش کیتی تے اوہ اوہناں نوں تیراں نال مار دے گا تے ایہہ کہہ کے اوہ دوبارہ سوں گیا۔ صاحباں نے مرزے دے سارے تیر توڑ دتے تے اوس دی کمان درخت دے نال ٹنگ دتی۔ جدوں صاحباں دے بھرا اوتھے پہنچے تے اوہناں مرزے نوں مار دتا۔ صاحباں وی مرزے نوں بچاندیاں ہویاں ماری گئی۔

ایہہ پنجابی دیاں دو مشہور لوک داستاناں نیں۔ ایس توں علاوہ وی پنجابی دیاں بہت ساریاں لوک داستاناں ہن جیہناں دے موضوعات مختلف ہن۔

❋❋❋

طلحہ حسنین

پنجابی شعری اصناف

پنجابی اصناف دا دائرہ بہت وسیع اے۔ پنجابی شعری اصناف وچوں درج ذیل مشہور نیں:

۱. حمد
۲. لوک گیت
۳. لوری
۴. تھال
۵. ماہیا
۶. دوہڑا
۷. ڈھولا
۸. بولیاں
۹. جگنی
۱۰. نظم
۱۱. کافی

ہُن اسیں ایہناں بارے تفصیل نال گل کر دے آں۔

۱. حمد:

حمد دا مطلب ربّ دی صفت، ثناء بیان کرنا، اوہدے مہر تے کرم دی آس نال کم چھوہنا، اوہدی قدرت تے یقین رکھنا، ایہہ مذہب دا انگ وی اے تے پنجابی شعر ریت وی۔ علّامہ یعقوب لکھدے نیں:

"اللہ میاں دی تعریف وچ آکھے گئے شعراں نوں حمد کیہا جاندا اے۔"

حمد عربی دا لفظ اے، ایس دے لغوی معنی تاں تعریف، وڈیائی، مدح بیان کرنا اے۔ ادب وچ حمد نوں قدرت دی وڈیائی تے تعریف بیانن لئی خاص مرتبہ دتا گیا اے۔ ہندی ادب وچ ایس نوں "منگلا چرن" آکھیا جاندا اے۔

ہُن حمد دے کجھ شعراں نوں ویکھنے آں۔ شاہ حسین دی سری راگ وچ لکھی کافی پیش ہے۔

ربّا میرے حال دا محرم تُوں
اندر توں ہیں، باہر توں ہیں روم روم وچ تُوں
تو ای تانا، تو ای بانا سبھ کجھ میرا تُوں
کہے حسین فقیر نمانا، میں ناہیں سب تُوں

۲. لوک گیت:

لوک گیت دا مطلب اے "لوکاں دے گیت" عام لوکاں دیاں خوشیاں دیاں مونہہ بولدیاں تصویراں۔ ایس وچ ایہناں دیاں دُکھاں درداں دیاں کہانیاں ہوندیاں نیں۔ ایہہ شاعری دی اِک اجیہی صنف اے جیہڑی دنیا دے ہر کونے وچ رائج اے۔ ماحول دی عکاسی دا اک بڑا اوڈا ذریعہ۔ سمندراں تے دریاواں دے کنڈھیں وسن والیاں دیاں لوک گیتاں وچ لہراں دا ذکر ہووے گا۔ پہاڑی علاقیاں وچ پہاڑاں تے پہاڑی شیواں دا۔

۳. لوری:

لوری نکیاں بالاں نوں پرچاون یا سوان ویلے ماواں دیندیاں نیں۔

الھڑ بلھڑ باوے دا
باوا کنک لیاوے گا
باوی بہہ کے چھٹّے گی

۴. تھال:

تھال الھڑ مٹیاراں دا گیت اے۔ ایہہ ٹھیکراں نال وی پایا جاندا اے، تے کھدّو نال وی۔ ایس راہیں ان بُجھیاں سِکاں سدھراں نفرتاں تے پیار جھاتیاں ماردے نیں۔

کھوہ وچ پانی ماں میری رانی
پیو میرا راجا ہیٹھ گھوڑا تازا

۵. ماہیا:

پنجابی ادب وچ ماہیے دا لفظ ماہی یعنی محبوب لئی استعمال کیتا جاندا اے۔ کجھ لوکاں دا خیال اے کہ پوٹھوہاری علاقے وچ اَج توں صدیاں پہلاں اک ''ماہیا'' ناں دا عاشق ہو گُزریا اے اوہدی نسبت نال ماہیا کسان جواناں تے مٹیاراں دا گیت اے۔

ایس وچ حسن و عشق دی حقیقت پائی جاندی اے۔ ایس وچ تِن مصرعے ہوندے نیں اصل گل کیہ دوجے مصرعے وچ ہوندی اے۔ جدوں مرد عورت دوویں آمنے سامنے ہو کے گاون تے بڑا لُطف آئوندا اے۔

سپ پانی چیر گیا
غیراں دے سنگ رَل کے

ڈھولا بدل ضمیر گیا

ساڈے بُوئے اگے سپ بہندا
ہس کے نہ لنگھیا کرو
ساڈے ماپیاں نوں شک پیندا

لال دھنائی ماہیا
تداں ساڈی عید ہوسی
جداں مکسی جدائی ماہیا

سونے دا کِل ماہیا
لوکاں دیاں رون اکھّیاں
ساڈا روندا اے دل ماہیا

باقی اصناف کسی اک علاقے وچ پر چلت نیں پر ماہیا سبھ توں سِر کڈھواں تے اُبھرواں اے، ایس نوں پُورے پنجاب دی نمائندگی دامان پر ان اے۔

ماہیا لفظ ''ماہی'' توں نکلیا اے، جس دا مطلب محبوب اے۔ ایس نال الف ندا یہ رلا کے ''ماہیا'' بنالیا گیا اے جیہڑا کہ محبوبہ، سجن، پیارا، ڈھولا تے معشوق دے معنیاں وچ آندا اے۔ ماہیا ڈھول دی علامت اے تے ڈھول محبوب دی علامت وی اے۔ ایہہ لفظ ''ماہی'' وچوں نکلیا اے تے ماہی آہندے نیں ڈنگر چارن والے نوں۔ ماہی دا لفظ ڈنگر چارن والے دے معنیاں وچ تے محبوب دی علامت دے طور تے وی ورتیا جاندا اے۔

۶. ڈھولا

ڈھولا ڈھول توں نکلیا اے۔ ڈھول محبوب نوں مخاطب کرن لئی استعمال کیتا جاندا اے۔ تے ڈھول نال الف ندا ایہ لا کے ڈھولا بنا لیا جاندا اے یعنی ڈھولا دے معنی نیں، اے ڈھول یا اے محبوب۔ ایس گیت وچ مٹیاراں اپنے محبوب دی قربت دی آرزومند ہوندیاں نیں اوس نوں اپنے دل دی گل کہن دا جتن کر دیاں نیں۔

اُچی ماڑی تے ددھ پئی رڑکاں
مینوں سارے ٹبّر دیاں جھِڑکاں
تیرے پچھے جھلی آں وے ڈھولا
ڈھول کملا

اُچی تیری ماڑی تے پوا، دے بنگلہ
اسیں ایتھے تے ڈھولا لہندے
ساڈے سِریں تے ہل پئے واہندے
اسیں پئے سہندے جیویں ڈھولا
بازار وکیندی کھکھڑی
میں سک سک ہو گئی لکڑی
تینڈیاں غماں وچ جیویں ڈھولا

۷. دوہڑا:

''دوہڑا'' نوں دوہاوی کہیا جاندا اے۔ ایہہ ایسی صنف اے، جس وچ عام طور تے اخلاقی موضوع اُتے

لکھیا جاندا اے۔ پنجابی دے صوفی شاعراں نے اجیہے مٹھے تے پیارے دوہڑے کہے نیں۔ اوہناں دی پنجابی ادب وچ لوک گیتاں وانگ ای اہمیت اے۔ دوہا عام طور تے نعت، کافی یاں قوالی توں پہلاں بولیا جاندا اے۔

"میں کالی مینڈا، ماہی کالا اسیں کالے لوک سدیندے
قرآن مجید دے حرف وی کالے جیہڑے وچ مسیت پڑھیندے
کوہ طور دا سرمہ وی کالا جیہڑا اکھیں وچ گھتیندے
غلام فریدا، گورے رنگ کیہ کرنے جیہڑے گلیو گلی وکیندے"

دوہڑے عام طور تے دو مصرعے دے ہوندے نیں۔ ایہہ کئی قسم دے ہین۔ ۲۸ ماترے دی ٹک والے زیادہ مشہور نیں۔ ایس وچ وسرام ۱۶ یا ۱۵ ماترے بعد ہوندا اے۔ ونگی ویکھو:

دل دے کے وِدیا پڑھو، گُن ایس جیہا نہ ہور
ودیا باجھ منکھ ہے سچ مچ ڈنگر ڈھور

....

اساں سمجھ گئے تواڈے پیاراں کوں چنگے پیار کریندے رہے او
اِڈوں نال ساڈے اُڈوں غیراں، دوہیں پاسے رکھ ویندے رہے او
وچ بہہ کے ساڈیاں دشمناں دے ساڈے راز کھلیندے رہے او
اُتوں اظہر بڑے ہمدرد رہے وچوں، جڑھاں کپیندے رہے او

۸. بولیاں:

بولیاں گانے جیہی صنف اے۔ بولیاں ہمیشہ بھنگڑے ناچ نال بولیاں جاندیاں نیں۔ جدوں وساکھ دے مہینے کنکاں دیاں فصلاں پک جاندیاں نیں تے جت زمیندار اپنیاں کنکاں پکیاں ہوئیاں ویکھ کے خوشی نال

پھل جاندے نیں اتے خوشی وچ بھنگڑا پاؤندے نیں ایس بھنگڑے نال جیہڑے گیت گائے جاندے نیں اوہناں نوں بولیاں کیہا جاندا اے۔

چن چمکے رُکھاں دے اوہلے، بنیریاں توں لوک جھاکدے
اساں ہوٹھاں نوں لائے جندرے، پر اکھیاں تے واہ کوئی نہ

پنجابی شاعری دی ایس ای صنف نوں امرتا پریتم ہوراں نے باراں ماہ دے روپ وچ پیش کیتا اے۔ ٹپے وانگوں ایہد اپہلا مصرعہ محض ضرورت شعری لئی تے مہینے داناں دسن لئی کہیا گیا اے۔

بارہیں برسیں کھٹن گیا
تے کھٹ کے لیاندی چاندی
دھیے نی پسند کرلے
گڈی بھر منڈیاں دی آندی
دھیے نی پسند کرلے

۹. بھنگڑا:

بھنگڑا اک موسمی ناچ اے۔ جدوں وساکھ دے مہینے وچ کنکاں دیاں فصلاں پک جاندیاں نیں تے جٹ زمیندار اپنیاں کنکاں پکیاں ویکھ کے خوشی نال پھُل جاندے نیں۔ اتے خوشی وچ بھنگڑا پاؤندے نیں۔

۱۰. جگنی:

اصل وچ جگنی داموضوع رومان ہوندا اے، پر کجھ اجیہیاں دی ملیاں نیں جیہناں وچ حمد، ثناتے نعتیہ کلام وی پایا جاندا اے۔ ایہناں توں علاوہ معاشرے دی اصلاح لئی ایہہ گیت لکھے جارہے نیں۔ اصل وچ جگنی اک زیور داناں اے تے ایس زیور دے ناں تے ہی جگنی لوک گیت مشہور اے۔

جُگنی جاوڑی وچ روہی

جٹاں پھڑ سوہاگے جوئی

اوتھے رورو کملی ہوئی

پیر میریا جگنی

او سائیں میریا جگنی

۱۱. نظم:

نظم اک خوش گوار شعری صنف اے۔ ایہہ بھارت تے پاکستان دے پنجابی خطے وچ بہت مشہور اے۔ ایس نوں اپنے خیالات، سوچاں، بھاوناں اتے جذبات بیان کرن واسطے استعمال کیتا جاندا اے۔

پنجابی نظم دیاں کئی قسماں نیں۔ ہر اک دا اپنا مخصوص ڈھانچہ تے خصوصیات نیں۔

i۔ غزل:

غزل پنجابی شاعری دی اِک صنف اے جو کہ اک سلسلہ وچ جوڑے گئے بند جیہناں دے مطلوب اکٹھے ہوندے نیں اتے پُرزے دا مطلب تنہا ہوندا اے۔ غزل عام طور تے رومان یا غمگین انداز وچ لکھی جاندی اے۔ مثلاً

نہ ساڈے ہتھ دنیا آئی

نہ ہویا ربّ راضی

ذاکر ملّاں، نرے خساری

کرن تفرقے باری

اللہ دے گھر ہون دھماکے

کتھے جان نمازی

ii۔ حمد:

حمد وی نظم دی اک قسم اے جس دا ذکر شروع وچ کیتا گیا اے۔

iii۔ نعت:

نعت پنجابی نظم دی اک شکل اے۔ جس وچ سوہنے پیغمبر محمد ﷺ دیاں صفتاں دا اظہار ہوندا اے۔ نعت عام طور تے تقدیس دے انداز وچ لکھی جاندی اے۔ ایس دے ہر جملے وچ ''ﷺ'' بار بار آندا اے جس دا مطلب اے کہ ''آپؐ تے سلام ہوئے''۔ مثلاً

آ گئے نبیاں دے سردار آ گئے نبیاں دے سردار
دو جگ وچ بہاراں آئیاں مہک پئے نیں گلزار
آ گئے آقاؐ تیرے میرے ورھدا نُور ہے چار چوفیرے
ربّ دی رحمت نے کر دینے سب دے بیڑے پار

v)۔ قوالی:

قوالی پنجابی نظم دی اک قسم اے ایس نوں موسیقی وچ رنگ رس بھرن دے طور تے ورتیا جاندا اے۔ ایس نوں موسیقی نال گایا جاندا اے۔ اے عموماً روحانیت تے خدا دے عشق دا اظہار ہوندی اے۔ مثلاً

اوتھے عملاں تے ہونے نیں نبیڑے
کسے نہیں تیری ذات پُچھنی

پنجابی نظم اِک وسیع تے کِھلارویں اظہار دا ذریعہ اے جو پنجابی زبان دی روایت تے ثقافت نال گہرا

تعلق رکھدی اے۔

وقت دے نال نال پنجابی شاعری نے کئی رنگاں تے صنفاں وچ ترقی پائی۔ جیہنوں مختلف صنفاں تے اوہناں دیاں خصوصیات توں پہچانیا جاسکدا اے۔

❁ ❁ ❁

فہامہ عبدالرحمٰن

پنجابی داستانیں

پنجاب دیاں لوک داستاناں دی تاریخ بڑی قدیم اے تے ایہہ پاکستان دے کئی علاقیاں دیاں لوک کہانیاں نال رلدیاں ملدیاں نیں۔ لوک کہانیاں دا آغاز قدیم دور توں ہویا، جتھے ایہناں نوں لوگ مختلف قبیلیاں تے طبقیاں دے درمیان بولدے سن۔ ایہناں لوک داستاناں دی روایت ہندوستان دی تاریخ دی بنیاد تے قائم اے تے ایہہ انڈو پاک تاریخ دے اہم جزو دے طور تے وی شمار کیتیاں جاوندیاں نیں۔

پنجاب دے کئی حصّیاں وچ لوک لوریاں بارے بہت ساریاں داستاناں سنائیاں جاوندیاں نیں۔ ایہہ کہانیاں کسے خاص علاقے یا حصّے دے نال منسلک نہیں بلکہ ایہہ کہانیاں مختلف علاقیاں توں ساڈے کول پہنچیاں نیں۔ ایہناں کہانیاں دے کوئی خاص مصنفین نہیں ہوندے۔ جیویں کہ نام توں ظاہر اے۔ لوک کہانیاں دا مطلب لوکاں دیاں کہانیاں نیں۔ ایہناں کہانیاں نوں مختلف عہد دیاں روایتاں جنم دیندیاں نیں، ایہناں نوں بناون وچ لوکاں دے مشترکہ جذبات تے احساسات حصّہ لیندے نیں تے ایہہ صدیاں دا طویل سفر طے کر کے کوئی اک روپ اختیار کر دیاں نیں۔ تے فیر نسل در نسل تے سینہ بہ سینہ امانت دی طرح اگلیاں نوں سُپرد کیتیاں جاوندیاں نیں۔ ایس طرح تحریر دی منزل تک پہنچن واسطے ایہناں نوں ان گنت زمانیاں توں گُزرنا پیندا اے۔

شفیع عقیل دی کتاب ''پنجابی لوک کہانیاں'' دے وچ سنتو کھ سنگھ دھیر لکھدے نیں:

> ''لوک کہانیاں دا مصنّف اج کل دی طرح کوئی اک شخص نہیں اے۔ ادب دی کوئی اک تاریخ کسے اک لوک کہانی دے کسے اک مصنّف داناں نہیں دس سکدی۔ جے کوئی ناں کسے

> لوک ادب دی کتاب دے وچ آؤندا اے تے اوس دا کم صرف ایہہ ہوندا اے کہ اوس نے لوک کہانیاں نوں لبھیا، محفوظ کیتا تے خوب صورت زبان تے دل چسپ روپ دا پیر ہن دے کے سمبھال دتا۔ اگرچہ اپنی تھانویں ایہہ وی کوئی چھوٹا یا سوکھا کم نہیں اے۔ سچی گل ایہہ جے کہ ہر لوک کہانی ہزاراں لوکاں دی سانجھی تصنیف اے۔" (پنجابی لوک کہانیاں۔ شفیع عقیل)

یعنی لوک کہانیاں دے نال جے کسے داناں منسلک ہوندا اے۔ اوہ کوئی اج کل دی طرح کوئی شخص نہیں، جس ایہناں نوں تصنیف کیتا۔ ایس وجہ توں لوک کہانیاں دا کوئی اک مصنّف نہیں بلکہ مختلف لوک ایس نوں اپنی زبان، اپنے رنگ تے اپنے طریقے نال بیان کردے نیں۔ ایس دی وجہ توں اسی لوک کہانی نوں کسے اک مصنف دی تصنیف نہیں آکھ سکدے بلکہ ایہہ کیئیاں لوکاں دی سانجھی تصنیف ہوندی اے۔

ایس ہی ضمن وچ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا دے وچ تحریر اے:

> "ایہہ فرض کیتا جاوے گا کہ ایہناں دا رشتہ یکساں طور تے قدیم زمانے نال اے تے چونکہ ایہناں مقبول لوک گیتاں یا لوک کہانیاں دا مصنف کوئی اک فرد نہیں اے، جس دا پتا چلایا جا سکے، یا جس داناں لیا جا سکے، ایس لئی ایہی کہیا جائے گا کہ لوک گیت لوک کہانیاں تے رزمیے عوام دی سانجھی تخلیق نیں۔" (پنجابی لوک کہانیاں۔ شفیع عقیل)

پنجابی لوک کہانیاں دے بارے اک غلط فہمی ایہہ وی اے جو ایہہ کہانیاں خیالی ہوندیاں نیں تے حقیقت توں دُور ہوندیاں نیں۔ ایہہ غلط فہمی ایس وجہ توں وجود وچ آئی اے کہ لوک داستاناں دے وچ کئی وڈے وڈے غیر حقیقی واقعے شامل ہوندے نیں۔ مثلاً جنون وچ جان دینا وغیرہ۔ اجیہے لوک ایہہ گل کردے ویلے ایس حقیقت نوں بھُلا دیندے نیں کہ اوہ صرف اک زاویے توں ویکھ کے ای اپنی رائے پیش کردے نیں۔ چوں کہ لوک کہانیاں دی تاریخ کئی ہزار سال پرانی اے ایس لئی اوس وقت دے لکھن والے لوکاں دے

کول اج دی جدید تے فکری لغت تے الفاظ نہیں ملدے۔ ایہہ لوک کہانیاں اوس ویلے لکھیاں گئیاں سن جدوں ادب تے تہذیب ترقی دیاں پوڑیاں چڑھ رہے سن۔ تاں کر کے اوس وقت دے لوکاں نے اپنے محدود علم نوں استعمال کر دیاں ہویاں ایہہ کہانیاں لکھیاں۔

ایہہ گل وی ٹھیک اے کہ اوہناں لوک کہانیاں وچ تاریخی یا سماجی عوامل اوس صورت وچ نہیں ملدے جیس طرح اسی توقع کرنے آں۔ ایس دی وجہ ایہہ ہے جو ایہہ کہانیاں اوس ویلے دے انساناں دی اجتماعی تخلیق نیں جیہڑے اج دے لوکاں دی طرح تاریخ تے سماج دا شعور نہیں رکھدے سن۔ ایس وجہ توں ایہہ مطالبہ کرنا کہ لوک کہانیاں وچ تاریخی یا سماجی رویہ ہووے، اک غلط فہمی اے۔

پنجابی زبان دے اک مشہور ادیب پروفیسر ونجارا بیدی ایہناں کہانیاں دے سماجی پہلوواں دی طرف اشارہ کر دے ہوئے کہندے نیں:

> ”لوک کہانیاں وچ صرف ان ہونی، افسانوی تے خواباں دی دنیا دیاں گلاں نہیں ہوندیاں بلکہ ایہناں دے سینے وچ بہت سارا اجیہا مواد وی بھریا ہوندا اے جو سانوں ایہناں دی حفاظت کرن تے مجبور کردا اے۔ ایہہ کہانیاں پڑھ کے جتھے اسی پرانے زمانے دے لوکاں دی سوچ تے ادبی رجحانات دا ٹھیک پتا لوا سکدے آں اوتھے اوہناں دے خیالات، روایات، رسم و رواج، رہن سہن، ارادے، توہمات، خواہشاں تے خوف وغیرہ دے بارے وی جان سکدے آں۔
>
> اوہناں کہانیاں دے وچ اپنے وقت دے بھائی چارے تے سماج دی وی پوری پوری جھلک ملدی اے تے ایہناں لوک کہانیاں دے وچ ساڈی ہسدی وسدی دنیانوں وی پیش کیتا گیا اے۔ (پنجابی لوک کہانیاں۔ شفیع عقیل)

جیکر اسی ایہناں کہانیاں نوں مثبت طریقے نال ویکھیے تے سانوں ایہہ پتا چلدا اے کہ ایہناں کہانیاں

دے پیچیدہ تے گنجھل دار موضوعاں وچ عام زندگی ہوندی اے۔ ایہہ کہانیاں سانوں انسانی جیون دی حقیقت نفسیات، عوامی عقائد، خیالات تے جذبات نال واقف کروانداں نیں۔ ایہناں کہانیاں دے ذریعے اسی اپنی تاریخ، تعلیم، عادتاں تے رسماں نال وی واقف ہوندے آں۔

مثال دے طور تے اسی وارث شاہ دی ہیر دے بارے گل کرنے آں۔ ہیر رانجھا دے ایس قصّے دے ذریعے سانوں اک نہایت خوبصورت تے بے مثال عشق دا پیغام ملدا اے۔ ایہہ کہانی سانوں ایس گل دا احساس دلاوندی اے کہ جدوں کوئی شخص اپنے محبوب نوں سچے دل نال چاہندا اے تے اوہدے واسطے کوئی وی کم ناممکن نہیں ہوندا، بھاویں اوہنوں کنی وی وڈی مشکل دا سامنا کرنا پوے۔ عشق دی حقیقت وی ایہہ جے کہ جیہڑے لوک دل توں عاشق ہوندے نیں اوہ کدی نہ کدی اپنی محبت نوں حاصل کر لیندے نیں، اگرچہ کدی کدی اوہناں واسطے بہت ساریاں مشکلاں تے دشواریاں پیدا ہوندیاں نیں لیکن اوہ اپنی محبت دی خاطر اوہناں دا سامنا کردے نیں۔ ایس وجہ توں ہیر رانجھا دی کہانی عشق دی حقیقت نوں بہت خوبصورتی نال بیان کردی اے۔

عشق و محبت دے علاوہ وی لوک کہانیاں وچ عام زندگی واسطے سبق آموز داستاناں شامل نیں۔ مثلاً اک مشہور پنجابی لوک کہانی جس داناں ''چڑیاں دا چمبا'' اے۔ ایہہ کہانی اک چڑیا دے بارے لکھی گئی اے جس نے اپنی پیدائش دے دن توں ای پرندے دی طرح پرواز کرنا شروع کر دتا لیکن چھوٹے ہون دی وجہ توں اوہنوں پرواز کر دیاں ہویاں کئی جانوراں نال ٹکر لگدی سی، جس دی وجہ توں اوس نے بڑی مار کھادی۔ آخر کار، چڑیا نے اک سیاہ کوئلے دی مدد نال اپنے پیراں نوں محفوظ بناون لئی ایک چمبہ بنایا۔ ایہہ چمبہ چڑیا دی جان بچاون لئی بہت اہم ثابت ہویا تے اوہ خیر و سلامتی دے نال اپنی پرواز کر دی تے ہن اوہ بغیر کسی ٹکراؤ دے چمکدی دھپ دے تھلے آرام دی زندگی گزار دی رہی۔ ایس کہانی توں سانوں ایہہ سبق ملدا اے کہ ہر مشکل نوں حل کرن واسطے سانوں آپ ای کوئی نہ کوئی رستہ تلاش کرنا پیندا اے۔ زندگی وچ اپنی مدد آپ دا سبق ایہہ کہانی بڑی

خوبصورتی نال دیندی اے۔

پنجابی زبان دے مشہور محقق تے نقاد ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ لکھدے نیں:

''ایہہ کہانیاں زندگی توں انتہائی قریب نیں، زندگی دیاں بنیادی اہمیتاں تے رہن سہن نوں اجاگر کرن والیاں نیں، تے اوہناں وچ عقل و دانش دا درس لفظاں تے گلاں وچ ای نہیں بلکہ عمل نال بیان کیتا گیا اے۔'' (پنجابی لوک کہانیاں۔ شفیع عقیل)

ایس ای کتاب دے وچ چیمبرز ٹوسینٹھ سنچری ڈکشنری دا وی ذکر اے جیہدے وچ لوک کہانی دی تعریف کجھ ایس طرح کیتی گئی اے:

''اک مقبول کہانی جیہڑی ماضی دی گھٹ یا زیادہ قدیم روایتاں نال زبانی طور تے منتقل ہوندی رہی ہووے۔'' (پنجابی لوک داستانیں۔ شفیع عقیل)

یعنی ایتھے وی ایس گل نوں من لیا گیا اے کہ لوک کہانیاں وچ صرف عقلی یا فرضی واقعات نہیں ہوندے بلکہ ماضی دیاں قدیم روایتاں کسی نہ کسی رنگ وچ ایہناں وچ موجود ہوندیاں نیں۔ فرق صرف ایہہ اے جو لوک کہانیاں دے وچ ایہہ روایتاں کئی تھاواں تے استعارات تے تشبیہات دا روپ اختیار کر لیندیاں نیں مگر ناپید نہیں ہوندیاں۔

پنجابی لوک کہانیاں وچ اہم کرداراں دا ذکر ملدا اے۔ جیہناں وچ سچا سودا، پیر جمال، حیدر خان، دولت نواز، رانجھا، ہیر وغیرہ شامل نیں۔ ایہہ کردار انسانی زندگی دے اوہناں اہم پہلوواں تے روشنی پاوندے نیں جیہڑے عام انسان نوں اوہدی زندگی دے وچ پیش آوندے نیں۔ ایہناں کہانیاں وچ عوامی زندگی دے حقائق، اخلاقی تے اجتماعی اصول، محبت، خوشی، غم، وفاداری، صداقت ورگے جذبات نوں وکھایا گیا اے۔

پنجابی لوک کہانیاں دے وچ لکھے گئے کرداراں دی اک اہم خصوصیت ایہہ وی اے کہ ایہہ کردار

عام زندگی توں ماخوذ نیں۔ ایس وجہ توں لوک ایہناں کرداراں نال اک محبت دا جذبہ پیدا کر دیندیاں نیں کیونکہ ایہہ کردار ایہناں دیاں زندگیاں وچ اک خاص مقام رکھدے نیں تے ایہہ کردار زندگی دے مختلف پہلوؤں دی عکاسی کردے نیں۔ لوک کہانیاں دی اہمیت ایہہ وی اے کہ ایہناں کہانیاں دے ذریعے انسانی خصوصیات نوں بہتر طور تے سمجھایا جاسکدا اے۔

پنجابی لوک کہانیاں زندگی دی تصویر کشی کردیاں نیں۔ لہٰذا اخیر تے اسی ایہہ گل کہہ سکدے آں کہ ایہہ سانوں خوشی، افسردگی، عاشقی، شادی، دکھ تے کُجھ دوسرے احساسات دے تجربے پیش کردیاں نیں۔ پنجابی فوک لور اک خود مختار قوم دی ذاتی، معاشرتی تے تاریخی حقیقتاں نوں ظاہر کردیاں نیں۔ اکثر پنجابی فوک لور دے اندر مختلف پیغام دتے جاندے نیں تے ایہہ اوس خاص علاقے دے لوکاں دیاں زندگیاں نال منسوب ہوندے نیں۔ فوک لور ول کئی لوکاں دے منفی رویے ہون دے باوجود اج تک ایہہ کہانیاں اپنی اہمیت سانبھی بیٹھیاں نیں تے ایہہ پنجابی ادب دا اک اہم سرمایہ نیں۔ ایس نوں سانبھن دی ذمہ داری ساڈی اے تے سانوں مغربی تہذیب توں متاثر ہون دی بجائے اپنے گھراں وچ بچیاں نوں وی ایہناں کہانیاں دے بارے دسنا چاہیدا اے۔

❋❋❋

احمد علی

حضرت بابا فریدؒ گنج شکر

بابا فرید گنج شکرؒ دا شجرہ نسب فرخ شاہ کابل دی اولاد نال جا ملدا اے تے اگر اس شجرہ نسب نوں چودہ واسطیاں پچھے لے کر جایا جائے تے بابا فرید دا شجرہ نسب امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نال جاملدا اے۔ بابا فریدؒ دے پر دادا نے چنگیز خان دے ایران تے توران اپر حملہ تے قبضے دے دور وچ اس دے سپاہیاں دے ہتھوں شہادت حاصل کیتی۔ ایس واقعہ دی وجہ توں اوہناں دے دادا شیخ شعیب نے اپنے وطن نوں خیر باد آکھیا تے لاہور آ کر رہن لگے۔ کجھ عرصہ لاہور رہن توں بعد اوہ پکا پکا ملتان دے علاقے کتھوال جا کر زندگی گزارن لگے تے ایدھر ای بابا فریدؒ دی پیدائش وی ہوئی۔ روایات دے مطابق بابا فریدؒ رمضان دے بابرکت مہینے وچ پیدا ہوئے تے والدین نے اوہناں داناں مسعود رکھیا۔ اوہ تے کسی تقریب دے موقعے تے حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ نے اوہناں نوں فرید الدینؒ دے ناں توں بلایا جیس کر کے آپؒ داناں فرید الدین مسعود پے گیا۔ گنج شکرؒ دا ناں وچ اضافہ ہون دی دو روایات نیں۔ اک دے مطابق باباجی دی اماں ہر نماز دے بعد اوہناں دی جائے نماز دے ہیٹھ شکر رکھدیاں سن لیکن اک دن اوہ بھُل گئیاں تاں اس دن وی اللہ دی کوئی کرامت کر کے شکر نکل آئی جیہدی وجہ توں اوہناں داناؤں گنج شکرؒ پے گیا۔ تے دوجی روایت دے مطابق بابا فریدؒ نے اِک دیہاڑے مٹی ہتھ دے وچ چکی ہوئی سی جیہڑی کسی کرامت کر کے شکر دے وچ تبدیل ہو گئی۔ بابا فریدؒ دے والد شیخ سلیمان سن، تے دوجی طرف اوہناں دی والدہ وی اک متّقی تے نیک خاتون سن۔ اوہناں دے نیک سیرت ہون دے بارے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کہندے ہن کہ اک راتی بابا فریدؒ دے گھر چور وڑ آیا لیکن نال ای انھّا ہو

گیا تے اگے پچھے ٹھوکراں کھان لگیا، جس توں اوہ سمجھ گیا کہ ایس گھر تے کسے کامل بزرگ دی رحمت ہے۔

جدوں بابا فریدؒ دی والدہ نے چور لئی دعا کیتی تے اس دی بینائی وی واپس آ گئی تے اوہنے اسلام وی قبول کر لیا۔

اولیاء دا کہنا ہے کہ بابا فریدؒ دے پیدا ہون توں کوئی سو سال پہلاں پیشین گوئی ہوئی سی کہ ہندوستان دے وچ اک کامل شیخ جنم لوے گا جیہدا ناں گنج شکر ہووے گا۔ بابا فریدؒ دے بقول ایہناں دے پیر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بابا فریدؒ نوں آکھیا سی کہ فریدؒ تینوں تے اللہ نے ایس طرح دا درجہ دِتا اے کہ جیس بندے نے وی تیرے پیراں یا مُریداں دا ہتھ پھڑیا اُس تے دوزخ دی اگ حرام ہووے گی۔ کسی شاعر نے کیہ خوب لکھیا اے:

افتخار زماں و فخر زمیں شیخ دنیا و دیں، فرید الدین
بندۂ حق فرید، قطب الدین مقتدائے یقین، فرید الدین

اوہناں دی نیک سیرت تے خدا خوفی دی وجہ توں اوہناں دے کوئی سو (۱۰۰) ناں رکھے گئے جس دے وچ سالک فرید، متقی فرید، بر حق فرید تے نطق اللہ فرید شامل ہن۔

بابا فرید دی زندگی وچ پیش آن والیاں کرامتاں دو نیں، لیکن اک کرامت اوہناں دی پیدائش توں پہلاں دی وی دسی جاندی اے۔ ہویا کجھ ایس طرحاں کہ جس ویلے آپ دی والدہ حمل وچ سن تے ایہناں دا بیر کھان نوں بڑا جی کردا پیا سی لیکن اوہ بیر مشکوک سن۔ شکم مادر دے وچ بابا فرؔید دی بے قراری دی وجہ توں والدہ بیقرار ہو گئی تے اوہناں نے بیر نہ کھائے۔ جدوں پیدائش دے بعد بابا فریدؒ نے ہوش سنبھالیا تے اوہناں اپنی ماں نوں ایہہ گل یاد دلائی تے اوہناں دی ماں وی بڑی حیران ہوئی کیونکہ ایس گل دا کسے ہور نوں علم نہیں سی۔

جدوں آپ پیدا ہوئے، اوہ رات رمضان دے مہینہ دی چاند رات سی لیکن کالے بدلاں تے مینہہ دی وجہ توں آسمان تے چند نظر نہیں آ رہیا سی۔ آپ دے والد اُس وقت شہر دے قاضی سن تے لوک اوہناں

کولوں رمضان دی شہادت لین واسطے جارہے سن کہ ایس دوران اک بزرگ شیخ سلیمان دے کول بابا فریدؒ دی پیدائش دی مبارک دین وسطے آ گئے۔ اوہناں نے شیخ صاحب نوں کہیا کہ تہاڈا منڈا قطب اولیاء ہے، اگر ایہنے اج ددھ پی لیا تے روزہ نہیں، ورنہ کل رمضان دا فتویٰ دے دیو۔ کرامت کجھ ایس طرح ہوئی کہ بابا فریدؒ نے دُدھ نہیں پیتا تے قاضی ہوندے ہوئے شیخ صاحب نے اگلے دن روزے دا اعلان کر دتا۔ جدوں آس پاس دے شہراں کولوں اگلے دن خبراں آئیاں تے پتہ چلیا کہ صحیح فیصلہ کیتا گیا اے کہ واقعی اوہ رمضان دی چاند رات سی۔ گل اینی جیہی نہیں سی بلکہ پورے مہینے ایہی صورتِ حال رہی۔ بابا فریدؒ مغرب دے بعد دُدھ پیندے تے صبح سحری توں پہلاں ددھ پینا چھڈ دیندے۔

اس دور وچ ملتان اسلام دا گڑھ سمجھیا جاندا سی تے کئی صوفیائے دین عالم ایدھر رہندے سن۔ ایسے کر کے بابا فریدؒ کھتوال توں ملتان شہر دی طرف تعلیم حاصل کرن لئی تشریف لے گئے۔ کہیا جاندا اے کہ بابا فریدؒ ملتان جا کر تعلیم تے دین دے وچ ایس حد تک رُجھ گئے کہ اوہ ہر روز اپنے سبق توں فارغ ہو کے اِک پُورا قرآن مجید پڑھ لیندے سن۔ جگ توں کنارہ کشی دی وجہ توں ایہناں دی عبادتاں تے گوشہ نشینی بڑی مشہور ہو گئی۔ ایہناں دیہاڑیاں وچ خواجہ قطب الدین ملتان آئے ہوئے سن، جس ویلے اِک دیہاڑی اوہناں دی نظر مسجد سبق پڑھدے بابا فرید تے پئی، اس موقع تے دوناں دی آپس وچ پہلی ملاقات ہوئی تے قطب صاحب نے بابا فریدؒ نوں آکھیا کہ اپنی تعلیم پوری کر کے اوہ اوہناں دے شہر دہلی آ جاون۔ قطب صاحب دے چلے جان توں بعد بابا فریدؒ ملتان توں قندھار شریف ٹر پئے تے اودھر کجھ عرصہ رہن توں بعد بغداد پہنچ گئے۔ کجھ عرصہ گزارن توں بعد جدوں ملتان واپس آئے تے حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا تے شیخ سیف الدین خضری دی تھاں دے وڈے شیخ الاسلام کولوں روحانی تعلیم حاصل کیتی تے بالآخر خدا طلبی دے شوق دے وچ موئے ہوئے قطب لاقطاب دے حلقے وچ جا وڑے۔ کئی وڈے بزرگاں دی شہادت دے وچ ایہناں قطب دے ہتھ تے

بعیت لتی۔ بعیت لین توں بعد بابا صاحب نے خواجہ قطب دے آکھن تے غزنوی بوہے دے باہر ریاضت شروع کر دتی تے ہفتہ دے وچ اِک دیہاڑی مرشد دے ساہمنے پیش ہو جاندے۔

ایہہ واقعہ وی اوہناں دناں دا مشہور ہے جیہڑے ویلے بابا صاحب نے اپنا مشہور چار معکوس کیتا۔ ہُن ایہہ گل سچ ہے وے یا لوکاں نے وڈا کر بیان کیتی ہے لیکن کہیا جاندا ہے کہ بابا صاحب نے اک غیر آباد تے سُنسان مسجد دے کنویں دے وچ پُٹھا لٹک کے چِلّہ کٹیا۔ کہیا جاندا اے کہ مسجد دے موذّن نے بابا صاحب دے پیراں نوں رسّے نال بنھ کے پٹھا ٹنگ دِتا تے رسّے دا دوجا پاسا کنویں دے نال اِک درخت نال بنھ دِتا۔ چالیس دیہاڑے موذّن صبح فجر ویلے آندا تے رسا کھچ کے بابا صاحب نوں باہر کڈھدا تے بابا صاحب عبادت دے وچ مشغول ہو جاندے۔ ایسے طرح ایہہ وی گل بڑی مشہور ہے کہ بابا فریدؒ نے جنگلاں تے پہاڑاں دے وچ وی ریاضتاں کیتیاں، جتھے اوہناں دی غذا گھاس شاس سی۔ اک دیہاڑے بڑی ڈاڈھی پیاس لگی سی تے کسے بندے دی راہ تک رہے سن کہ کوئی پانی لے آوے۔ کول اِک کنویں دا پانی اُتے آ گیا جیہدے وچوں ہرناں نے آ کے پانی پیتا۔ پانی دی سطح ایڈی اُچی سی کہ کنویں دے وچوں مینڈک وی کُد کے باہر آ گئے لیکن جدوں بابا فریدؒ پانی پین لئی کنویں دی طرف ٹُرے تے کنویں دا سارا پانی کھچ کے واپس تھلے چلا گیا۔ ایس گل تے بابا صاحب نے کہیا کہ ہر ناں نوں پانی پلا کے جانوراں نوں کرم توں نوازدا ایں تے میرے ورگے عبادت گُزار دی واری پانی غائب کر دینا ہیں۔ اوہدے تے ندا آئی کہ فریدا! تیری نظر ڈول رسّی تے سی لیکن ہرناں دی نظر صرف خدا دی ذات تے سی جیہدی وجہ توں تُو پانی توں محروم رہ گیا ہیں۔ ندامت دی وجہ توں اوہ چالیس دیہاڑے واسطے کنویں دے وچ لٹکے رہے تے چالیہ دیہاڑیاں دے بعد جدوں مٹی مُنہ وچ پا کے روزہ افطار کیتا تے اوس مٹی دیاں ڈلیاں شکر دیاں ڈلیاں بن گئیاں۔

ایہہ ساریاں کرامتاں بابا فریدؒ خدا نال محبت تے اوہناں دی نیک صفتاں دی وجہ توں ہی نازل ہوئیاں

مثلاً خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماندے نیں کہ بابا صاحب بڑی غریبی تے تنگی دی زندگی گزاردے سن۔ اکثر ایہہ صورتِ حال ہوندی سی کہ دو، دو تِن، تِن دیہاڑے فاقے کٹنے پیندے سن۔ اوہ مزید دسدے نیں کہ مولانا بدرالدین اسحاق دے حوالے لنگر دِیاں لکڑیاں، جمال الدین ہانسولی دے متھے جنگل توں کریل دے درخت توں پھُل ہور حام الدین دے ذمے پانی لیانا سی تے آپو کھانا پکاندے سن۔ اک دیہاڑے نمک نہیں سی تے کول اِک دکان توں اُدھار نمک لیا کے کھانا پکایا، تے بابا صاحب دے سامنے رکھ دِتا۔ بابا صاحب نے نوالہ مُنہ دے کول لیا کے واپس بھانڈیاں وچ رکھ کے آکھیا کہ کھانے دے وچ اج کوئی مسئلہ ہے جس تے نظام الدین اولیاءؒ نے نمک دا مسئلہ سنایا۔ ایس گل تے بابا صاحب نے سختی نال کہیا کہ قرضہ لے کے کھان توں بہتر ہے کہ فقراء فاقے مر جاون۔ اوہناں دے آکھن تے کسی نے کھانا نہیں کھایا تے سارا دا سارا کھانا غریباں دے وچ ونڈ دِتا گیا۔ ایس طرح کہیا جاندا اے کہ بابا فریدؒ نوں شہرت توں بڑی نفرت سی جس دی وجہ توں اوہ زیادہ ویلے کلّے رہنا پسند کردے سن۔ اوہناں دی ایہہ کوشش رہندی سی کہ کسے نوں اوہناں دے حال دی خبر نہ ہووے۔ ایس گل تے اوہ اکثر اِک شعر کہندے سن۔

ہر کہ دے بند نام آوارہ ست
خانۂ او برون دروازہ است

ایہدا مطلب ایہہ سی کہ جیہڑا بندا اوی شہرت دے پچھے نسدا اے اوہ خدا توں قریب ہون دا موقع کھوہ دیندا اے۔ ایس گل دے اوہ اینے پکے سن کہ ہانسی دے وچ مولانا نور ترک دی مجلس وعظ دے وچ بوسیدہ کپڑے پا کے گئے ہوئے سن جس تے مولانا صاحب نے آپ دی بڑی تعریف کیتی، جس کر کے ہانسی دے وچ اوہ مشہور ہو گئے۔ ایس گل پچھے اوہناں نے ہانسی وچ رہائش چھڈ دِتی تے اجودھن ٹُر پئے۔

بابا فریدؒ اپنی پوری عمر لوکاں نوں اعلیٰ اخلاق تے دوجے انساناں دے نال محبت دا سبق دیندے رہے۔

ایس سبق نوں لوکاں دے دل دے وچ سماون واسطے اوہناں نے پنجابی دے وچ شاعری کیتی تے آپوں وی اوس سبق تے عمل کر کے وکھایا۔ ایہہ اوہی سبق اے جیہڑا اوہناں دی شاعری وچ آن والیاں نسلاں واسطے محفوظ کیتا گیا۔ انسان دی خواہشات تے دِلی حالات دے حساب نال ویکھیا جاوے تے پتہ چلدا اے کہ بابا صاحب نے انسانی ذہن دی تقریباً ہر اِک سوچ نُوں کھری تے سچی گلاں وچ کر دِتا اے۔ لیکن ایہہ گل وی کہنا صحیح نہیں ہووے گا کہ بابا صاحب صرف مذہبی شاعر سن کیونکہ اوہناں دا بنیادی سبق اخلاق تے آدھار سی جیہڑا کہ مذہب توں ہٹ کے انسان دی فطرتی شے ہے۔ بابا جی دا کجھ کلام ملاحظہ فرما کے دسو کہ ایہ گل صحیح ہے کہ نہیں۔

زندگی تے موت دے بارے اوہ لکھدے نیں:

جِت دہاڑے دھن وری، ساہے لئے لکھاءِ
ملک جو کئی سنیندا، منھ وکھائی لے آءِ

ایہدا مطلب اے کہ جس دہاڑے عورت دی منگنی ہوئی (یعنی روح انسان دے جسم وچ داخل ہوئی) اُسی دن انسان دے ویاہ دا دیہاڑا رکھ لِتا گیا (مطلب انسان دی موت دا وقت طے کر لیا گیا)۔ تے فرشتہ عزرائیل جیہدا ناں صرف لوکاں دے منہ توں سُنیا ہے، اوہ اوس دیہاڑے روح لین واسطے آ جاندا اے۔ حشر دے دیہاڑے لئی فرماندے نیں۔

والوں نکی پل سلات، کہن نہ سُنی آءِ
فرید کڑی پوندی ای، کھڑا نہ آپ مُہاء

ایس شعر وچ بابا فرید کہہ رہے ہن کہ پل صراط والاں توں وی پتلا ہونا ہے جس توں ہر بندے نے لنگھناں ہے۔ قیامت دے دیہاڑے ہر پاسے رولا پیا ہونا اے تے ایس واسطے ایہہ گل مناسب اے کہ توں دنیا داری دے وچ پین دی بجائے پل صراط توں لنگھن دی تیاری شروع کریں۔ ایسے طرح اپنی درویشی دی گل

کردے ہوئے کہندے نیں:

دَر درویشی گاکھڑی، چلّاں دنیا بَھت
بنھ اُٹھائی پوٹلی، کِتھے ونجاں گھت

ایس دے وچ بابا صاحب کہنا چاہندے نیں کہ فریدا، درویشی دا رستہ بڑا اوکھا ہے۔ بھاویں اُن لوکاں واسطے زندگی بڑی سوکھی ہے جیہڑے آخرت دی فکر نہیں کردے لیکن ہُن کیہ کریا جا سکدا اے جدوں فقیری دا لباس پا لیا ہے تے نال فقیراں دی مُشکلاں آلی گٹھڑی وی چک لئی اے۔

اوہناں دا اک ایہہ شعر وی سمجھن لئی بڑا ضروری اے:

فریدا دوویں بلندیاں، ملک بیٹھا آءِ
گڑھ لِتا گھت لُٹیا، دیوڑے گیا بُجھاءِ

ایہناں دوہاں اکھّاں دے سامنے موت دا فرشتہ آ بیٹھا تے اوہنے جسم اُتے قبضہ کر لیا تے جان کڈھ لئی، جس کر کے اکھّاں دے دیوے بُجھ گئے۔ لوک بولی وچ، موت تے بندے اُتے حملے دا سوہنا چتر اے کہ موت دے نال مقابلہ نہیں اے کیونکہ جیہڑی آئی ہے اوہنوں کون روک سکدا اے۔ فریدؒ صاحب دے حساب نال موت واسطے تیار رہن دا مطلب ہے کہ زندگی دے چھوٹے چھوٹے رولیاں نوں چھڈ کے اوس زندگی دی تیاری کرو جیہڑی حساب توں بعد آنی ہے جس لئی زندگی خدادیاں سماجی قدراں قیمتاں دے پیمانے موجب جیونی چاہیدی اے۔ اِک ہور موقع تے بابا فرؒید نے فرمایا اے:

فریدا میں بھُلاوا پگ دا، مَت مَیلی ہو جاءِ
گہلا رُوح نہ جاندا، سِر بھی مٹّی کھاءِ

بابا جی کہندے نیں کہ لوکی ایس فکر وچ رہندے نیں کہ کتے اوہناں دی پگ (دنیاوی شان و شوکت) نہ

مَیلی ہو جاوے۔ جد کہ اوہناں دی غافل روح نوں ایس گل دی خبر ای نہیں ہوندی کہ ایہہ پگ جس سِر اُتے دھری جاندی اے اوہ سِر وی اِک دیہاڑے مٹّی نے کھا جانا ہے۔ مطلب کہ بندے نوں زیادہ توجہ باطنی طور دی طہارت ول رکھنی چاہیدی اے۔

بابا فرید دی شخصیت تے فکر دے بے شمار پہلو ہن تے اوہناں دا فلسفہ ایڈا اودھیا ہے کہ لکھّاریا مصنّف نوں اپنی کم علمی دا احساس ہون لگ جاندا اے۔ دنیا دے علم دی جنی ترقی ہوندی جاوے گی، اوناں ہی بابا فریدؒ دے خیالاں دے اسرار واضح ہوندے جاون گے تے ایہہ ہی کوئی حال تے کیفیت میری ہے۔ ایس گل تے کجھ آخری الفاظ عرض کراں گا۔

گفتم	حدیث	درد	محبت
باصد	سجودے	باصد	سلامے

❁❁❁

ملک مودّت حسین

"پنجابی توں اردو تراجم"

ترجمے دی اہمیت تے دشواریاں:

ہر زبان دے ادب وچ ادبی تراجم نوں اک خاص اہمیت حاصل اے۔ ایذرا پاؤنڈ دا کہنا اے کہ:

"جیہڑا دور تخلیقی ادب دے لحاظ نال عظیم ہوندا اے، اوہی دور ترجمے دے لحاظ نال وی عظیم ہوندا اے۔"

پنجابی زبان و ادب دی عظمت دا اندازہ ایس گل توں وی لایا جاسکدا اے کہ پنجابی شاعری تے نثر دوہاں دا مختلف زباناں وچ ترجمہ کیتا گیا۔ ادبی تراجم دی اہمیت توں انکار نہیں کیتا جاسکدا اگر ایہہ کم بڑا اوکھا تے تکنیکی مہارت منگدا اے۔ پہلا مسئلہ ایہہ ہے کہ اِک زبان دے لفظ دا دوجی زبان وچ کامل مترادف لبھناں بڑا مشکل اے۔ دوجا مسئلہ ایہہ ہے کہ ہر زبان دے اپنے محاورے تے روز مرّہ دیاں گلاں ہوندیاں نیں جیہناں نوں دوجی زبان وچ منتقل کرنا ناممکن ہو جاندا اے۔ نثر دا نثر وچ ترجمہ تے فیر کسی حد تک ہو ای جاندا اے پر گل جدوں منظوم ترجمے دی آ جائے تے مشکل ودھ جاندی اے۔ مترجم لئی ضروری اے کہ شاعر دے ذہنی تے فکری رجحانات نوں سمجھے تے اوہدے شعراں دے پچھے لُکی ہوئی فکر تے پیچیدگیاں نوں صحیح طرح بیان کرے۔ اِک ودھیا ترجمے لئی مترجم دا دوہاں زباناں دی ادبی اقدار نال واقفیت ہونا لازم اے تا کہ مترجم اُس ادبی شاہکار دی روح نوں پا سکے۔ جدوں گل پنجابی صوفی شاعراں دے کلام دی کیتی جائے، ایہناں دا ترجمہ کرن لئی مترجم دا قابل تے ذہین ہونا بڑا ضروری اے۔ اس تحریر وچ اسی دو عظیم پنجابی شاعراں دی شاعری دے تراجم دا جائزہ

لواں گے۔

پیر مہر علی شاہ دے کلام دا ترجمہ:

حضرت پیر مہر علی شاہؒ دے نسب پاک دا سلسلہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نال رلدا اے۔ آپ دی ولادت اوس دور وچ ہوئی جدوں بر صغیر پاک و ہند جنگ آزادی دے پُر آشوب دور وچوں گزر رہیا سی۔ آپ ایس تاریک دور وچ اسلام دی روشنی لے کے نمودار ہوئے۔ آپ دا اکثر وقت عبادت تے ریاضت وچ گُزردا مگر طبعاً شاعری وی لکھدے سن۔ اکثر صوفی شاعراں دی طرح آپ دے ہاں وی عقیدہ وحدت الوجود دا تصوّر ملدا اے۔ ایہناں دے عشق و محبت دی کیفیت ذہنی تے مطالعاتی نہیں بلکہ مشاہداتی تے تجرباتی اے۔

کرم حیدری نے اپنی کتاب وچ پیر صاحب دی شاعری دا منظوم ترجمہ کیتا اے تے نال ہی نال مشکل شعراں دی تشریح وی کیتی تاں جو قاری لئی آسانی ہووے۔ اسی پیر صاحب دے نعتیہ کلام تے نظر پاوندے آں:

روندیاں نیناں نُوں سمجھا رہی
لکھیا پڑھیا سب بھلا رہی
ہک نام سجن دا گا رہی
رگ رگ تے لوں لوں ساہاں نال
دل لگڑا بے پرواہاں نال

منظوم ترجمہ:

روتی آنکھوں کو سمجھایا بھی
جو لکھا پڑھا تھا بھلایا بھی

رگ رگ نس نس نے گایا بھی
ہر سانس میں نام اس ساجن کا
دل بے پرواہ کے سنگ لگا

پیر صاحب دے اشعار بڑے عام فہم تے سادہ نیں مگر کرم حیدری نے بڑی خوبصورتی نال ایہناں دا ترجمہ کیتا اے۔ ردیف، قافیہ تے وزن دا خاص خیال رکھیا گیا اے تے شاعری دے خیال و تصوّر نوں عام بندے تک سادہ زبان وچ پہنچان دی کوشش کیتی گئی اے۔ پیر صاحب نے اپنے کلام وچ آپؐ نال اپنی محبت و عقیدت دا اظہار بڑے وکھرے انداز وچ کیتا اے۔

ایس دے بعد اسی پیر صاحب دے لکھے ہوئے اِک مرثیہ تے نظر پاندے آں:

آکھے نبیؐ ، علیؓ تے فاطمہ زہراؓ
فرزند حسینؓ تو ویہلا آ
سانوں سِک تری پل پل دی اے
لائی مہندی خون اجل دی اے

منظوم ترجمہ:

پیغام تھا نبیؐ و علیؓ و بتولؓ کا
بیٹے حسین، ہم سے تو ملنے جلد آ
اب ایک ایک پل کی بھی فرقت بلا کی ہے
مہندی اجل کے ہاتھوں پہ خونِ وفا کی ہے

پیر صاحب نے اپنے ایس شعر وچ امام حسینؓ دی عظیم قربانی نوں خراج عقیدت پیش کیتا اے۔ ایس

شعر وچ کہندے نیں کہ حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ تے حضرت فاطمہؓ اپنے لختِ جگر امام حسینؓ دے منتظر نیں تے ایہناں نوں جنت وچ مدعو کر رہے نیں۔ کرم حیدری نے ایس شعر نوں بڑی مہارت نال اردو وچ ڈھالیا اے تے پیر صاحب دا معنی و مفہوم قاری تک صحیح طرح منتقل ہو جاندا اے۔ لہٰذا ایہہ کیہا جا سکدا اے کہ کرم حیدری نے ایس ترجمے دا حق ادا کر دتا اے تے پوری کوشش کیتی اے کہ پیر صاحب دا کلام اگلی نسل تک پہنچے۔

بابا بلھے شاہؒ دے کلام دا ترجمہ:

عبداللہ شاہ المعروف بابا بلھے شاہؒ کسے تعارف دے محتاج نہیں۔ صوفی ادب دی سب توں مشہور صنف بابا بلھے شاہؒ دیاں کافیاں نیں۔ ہندو مسلمان دوویں اوہناں نوں عزت دی نگاہ نال ویکھدے نیں۔ ایہناں دیاں کافیاں وراگ تے پریم نال بھریاں ہوئیاں نیں۔ عبدالغفور قریشی ایہناں دی شاعری بارے لکھدے نیں:

> ”بلھے شاہ دے لہجے وچ بے باکی اے، جذبہ قلندرانہ اے تے اوہ بے دھڑک سیاسی رولے گولے دی نندیا کردے نیں۔ کلام وچ تشبیہات تے استعاریاں دا استعمال کردے نیں، قرآنی آیتاں تے نبی پاکؐ دیاں حدیثاں دے حوالے دیندے نیں۔“

ڈاکٹر امجد بھٹی نے اپنی کتاب وچ بابا بلھے شاہؒ دیاں کافیاں دا ترجمہ کرن دی کوشش کیتی اے۔ ڈاکٹر صاحب لکھدے نیں کہ بابا بلھے شاہؒ دی شاعری سوال تے حیرت دی شاعری اے۔ جیہدا ترجمہ کرنا کوئی سوکھا کم نہیں۔ بلھے شاہؒ دی زبان ٹھیٹھ پنجابی اے، جس دے کجھ الفاظ ہُن استعمال نہیں ہوندے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تکنیکی مہارت تے قابلیت دی بنیاد تے بھرپور کوشش کیتی اے کہ ترجمہ اصل شاعری دے قریب تر رہے تاکہ تفہیم کلام وچ آسانی ہووے۔

ایس حوالے نال اسی ڈاکٹر صاحب دی ترجمہ کیتی ہوئی بابا بلھے شاہ دی اک مشہور کافی دا جائزہ لیندے آں۔

تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا
تیرے عشق نے ڈیرا، میرے اندر کیتا
بھر کے زہر پیالہ، میں تاں آپے پیتا
چھیتی بوہڑیں وے طبیبا، نہیں تاں میں مر گئی آں

اردو ترجمہ:

"تیرے عشق نے تھیا تھیا کر کے نچایا ہے۔ تیرے عشق نے میرے من میں ڈیرہ لگایا ہوا ہے۔ میں نے زہر کا پیالہ بھر کے خود ہی پیا ہے۔ اے طبیب! جلد پہنچ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔"

ڈاکٹر امجد دا ترجمہ لفظی اعتبار نال تے ٹھیک اے تے سمجھ وی آ جاندا اے۔ مگر اس دے وچ منظوم ترجمے ورگی خوبصورتی نہیں۔ لہٰذا اسی ایہہ کہہ سکدے آں کہ کسی وی قسم دے ترجمہ لئی ادبی مہارت دی لوڑ ہوندی اے تاں مترجم لئی ضروری اے کہ شاعر دے فکری رجحانات تے نظری اعتبارات دی صحیح ترجمانی کرے تا کہ اصل دی روح نوں قاری تک پہنچایا جا سکے۔

❁❁❁

ندیم احمد

"میں ول آساں"

سویرے دے نو وجے دا ٹائم ہئی۔ دروازہ کھٹکن دی آواز آئی۔ چاچی دروازہ کھولیا۔ سامنے شائستہ نظراں تلے کیتے کھڑی ہئی۔ چاچی نے ہونکوں اندر سڈیا۔ اندر آندے ہی شائستہ دی نظر عمیر کوں گولن لگی۔ عمیر کو کتھیں نہ پاتے، اوہندی زبان وچوں خود بخود عمیر دے بارے لفظ نکلنے شروع تھی گئے۔

شائستہ: چاچی......... عمیر کتھاں گئے؟

چاچی: وئے ساڈی دِھی رانی، پڑھ کے ول آئی اے۔

شائستہ: ہاں چاچی! میں اپنی پڑھائی مکمل کر کے امریکہ کوں خداحافظ آکھ آئی آں پر تہاڈا پُتر نظر نہیں آیا۔

چاچی: او تاں اج کل لاہور ہوندے، اتھاں رہندے تے اتھاں ہی نوکری کریندے۔

شائستہ: (کھلدے ہوئے) کیوں، ہو کوں اتھاں کئیں نوکری نہیں ڈیتی؟

چاچی: نہ میڈی دِھی! او وڈا افسر لگ گئے۔ تیڈا چاچا ڈسیندے او پولیس دا وڈا ملازم تھی گئے۔

چھے سالاں پہلے عمیر تے شائستہ بہوں چنگے دوست ہن۔ ہکو وسیب ہئی، محلہ سانجھا ہا تہوں ہک بے نال واقفیت وی ہئی، بچپن کولوں کالج تئیں ہکے استادیں کولوں پڑھدے ہن۔ وقت ڈھلدا گئے، عمر ودھدی گئی تے بچپن دی دوستی جوانی دی محبت وچ تبدیل تھی گئی۔ بارہویں پڑھن دے بعد شائستہ دا باہروں پڑھن دا ارادہ تھی گیا۔ اوندے ماں پیو وی ایہو چاہندے ہن۔ شائستہ سائنس پڑھن چاہندی ہئی تے عمیر پڑھائی چھوڑن چاہندا ہا۔

بس ایہے ڈوہناں دی آخری ملاقات ماسٹر غلام رسول دی بیٹھک اچ تھئی ہئی، جتھاں محلے دے بال کیمسٹری پڑھدے ہن۔

عمیر اوں جیھاڑے شائستہ کوں صاف الفاظ اچ آکھے کہ اوہ اتھئیں رہ کے پڑھے، باہر نہ ونجے، او ہوندی ذمّہ داری چیسی۔ شائستہ کوں عمیر دی گالھیں تے کاوڑ آگئی۔ ہوں عمیر کوں نہ پڑھن تے نالائقی دے میہنے ڈتے عمیر ہونکوں وت وی روکن دی بہوں کوشش کیتی مگر شائستہ دے دماغ وچ صرف سائنس پڑھن دا تے امریکہ ونجن داشوق ہئی۔ او اتنی اوبالی ہئی کہ ہوں آپنی بچپن دی محبت کوں وی بھلا ڈتا۔ ویندے ویندے عمیر دی اکھاں وچ ہنجھواں داسیلاب ہا، تے ہوندے آخری الفاظ ایہہ ہن:

شائستہ تیکوں ”میں یاد آساں“

ہک جوانی ڈوجھا خرچ پلے، پچھیں سدھی راہ گھِن کون چلے۔ شائستہ باہر ولگی گئی۔ عمیر کوں وی ہوندے پیو، لاہور پڑھن لئی بھیج ڈتا۔ عمیر نے پنجاب یونیورسٹی اچ آرٹس دے مضمون اچ داخلہ گھِن گھدا۔ پہلے سال تاں عمیر شائستہ دی مونجھ وچ روندا رہیا۔ لیکن اللہ سائیں ہوکوں رُلن نہ ڈِتا۔ شائستہ نہ سہی مگر ہوکوں ہک اچھی سنگت مِل گئی جیہنے عمیر کوں پڑھن تے سی ایس ایس دا امتحان ڈیون واسطے تیار کیتا۔ بی۔ اے کرن بعد عمیر نے مقابلے دے امتحان دی تیاری شروع کر ڈتی۔

ڈوجھے پاسے شائستہ پڑھائی دے ناں تے آپنی تہذیب کنے دُور تھیندی ویندی ہئی۔ ہوں عمیر کوں بے کار سمجھ کے وسار چھوڑیا۔ بہوں خود غرض تھی گئی تے آپنی خود غرضی کوں آپنی اعلیٰ تعلیم سمجھدی ہئی۔

سی ایس ایس دا امتحان پاس کرن دے بعد عمیر پولیس دے محکمے وچ وڈا افسر بھرتی تھی گیا۔ ہوندی وسیب وچ وڈی عزت ہئی۔ جیہڑے لوگ ہونکوں نالائقی دا طعنہ ڈیندے ہن، ہن ہوندی تعریف کریندے ہن۔ نوکری لگن بعد عمیر نے ہوں لڑکی نال شادی کر گھِدی جئیں ہونکوں سی ایس ایس کرن واسطے منایا ہئی۔

ہک سال بعد عمیر دے گھر بال پیدا تھی گیا تے ہوں لاہور وچ اپنا گھر گھِن گھدا اور مستقل طور تے لاہور وچ ہی شفٹ تھی گیا۔

اج چھے سالاں بعد شائستہ پاکستان واپس آئی۔ ہوں عمیر دے بارے وچ پتا کرن واسطے ہوندے گھر گئی۔ او عمیر کوں اپنی کامیابی تے تعلیم دے بارے ڈساون چاہندی ہئی۔ عمیر دی نوکری بارے جان کے ہونکوں بہوں خوشی تھی، او عمیر کوں مبارک باد ڈیون چاہندی ہئی۔ ہوں چاچی کولوں عمیر دا پتا گھِن تے لاہور ونجن دا ارادہ کیتے۔

دروازے دی گھنٹی وجی۔ نوکر نے دروازہ کھولیا تے سامنے ہک خاتون کھڑی ہئی۔ نوکر نے خاتون کولوں پوچھیا کہ کَنوں ملنا اے۔ شائستہ دے منھ وچوں عمیر تے ہوندے وسیب داناں سُن کے نوکر ہونکوں اندر گھِن آیا۔ نوکر نے شائستہ کوں ہک کمرے وچ بٹھایا تے خود عمیر کوں شائستہ بارے دسن چلا گیا۔ کجھ دیر بعد ہک چھوٹا بال باہر وڈیندے ہوئے کمرے وچ داخل تھیا۔ شائستہ کوں بالاں نال بہوں لگاؤہا۔ ہوں چھوٹے بال کو فورن اپنی گود وچ چا گھدا۔ او بال نال کھیڈن پئے گئی۔ گالھیں گالھیں وچ ہونکوں پتا لگیا کہ او بال عمیر دا ہئی۔ شائستہ اُتھوں فورن واپس لگی گئی۔

نوکر نے عمیر کوں شائستہ بارے ڈسیا۔ او دوڑدے ہوئے ہوں کمرے دی طرفوں بھجیا لیکن ہوں وقت شائستہ لگی گئی ہئی۔

❋ ❋ ❋

عائزہ شجاع

پیاری ڈائری

جیویں لاہور دے پرانے شہر تے سورج چڑھیا، میں اِک کورس پروجیکٹ لئی، اپنے متراں نال، مادھو لال حسین دے تاریخی مزار تے اپڑی۔ مزار دا سفر اپنے تئیں اک مہم جوئی سی۔ پرانے شہر دیاں تنگ گلیاں وچوں لنگھناں اِک اوکھا کم سی۔ ایہدے واسطے سانوں اپنی گڈی کھلار کے رکشے وچ جانا پیا۔ عطر دی خوشبو تے موسیقی دے سُر سانوں اپنے رستے دا پتہ دس رہے سن۔

مزار تے گہما گہمی سی۔ تے ہر قسم دے لوک صوفی بزرگ نوں سلام کرن واسطے آئے سی۔ ساری خلقت دے چہرے تعظیم وعقیدت نال چمک رہے سی۔ میں وی اپنے آپ نوں ایس ماحول وچ گم ہوندا محسوس کیتا۔ ایس مقدس تھاں دے نظاریاں تے آوازاں وچ اک جادو سی جیہدے وچ اساں سب گواچ گئے سی۔

جدوں میں مزار دے ویہڑے وچ چکر لا رہی سی تے میں اپنے آپ نوں اِک دم پُر سکون محسوس کیتا۔ ایسا لگ رہیا سی کہ مزار دیاں دیواراں سانوں ماضی دے اوہناں بزرگاں دے قصے تے کہانیاں سنا رہیاں نیں جو میرے توں پہلے ایس پاک زمین تے ٹر آئے سی۔

ایس مزار دے ہر کونے کھدرے نوں ویکھن واسطے اسیں کنے گھنٹے لگا دتے۔ دیواراں تے سجن والی خطاطی توں لے کے ہر شے اپنی اِک وکھری کہانی سنا رہی سی۔

فیر دربار وچ سانوں اِک فقیر ملیا۔ جس نے سانوں مادھو لال حسین دی اِک مشہور کافی سنائی، جیہدے وچ عشقِ حقیقی، محبت، روحانیت تے روح دی وحدت داذکر سی۔ جس نوں سن کے ساڈے دل حیرت تے سکون

نال بھر گئے۔

جدوں سورج ڈبن لگا تے سانوں وی سمجھ آ گئی کہ ساڈے جان دا ویلا آ گیا ہے۔ اسیں ساریاں نوں رب راکھا آکھیا تے گھر نوں ونجے۔ اچھا ہُن کل گل کراں گے۔

رب راکھا!

اج دن دا آغاز خوشگوار ملاقاتاں تے پرانی یاداں نال کیتا۔ لمز (LUMS) یونیورسٹی دی ہل چل وچ قدم رکھدے ہی دو جانے پچھانے لوکاں نے میرا استقبال کیتا۔ اوہ میرے پرانے متر سی جو سالاں بعد مینوں ملن آئے سن۔

دن دی شروعات اساں نے پرانے اسکول وچ کیتی۔ جتھے اسیں ہالاں وچ گھمدے گھماندے تے بہت شرارتاں کردے سی۔ پتا ہی نہیں چلیا ویلا اِنج بیت گیا۔ بعد وچ اسی اسکول دے کول موجود پارک وچ آ بیٹھے، جتھے بچپن وچ اسی کرکٹ کھیلدے سی۔ ایتھے اسیں خوب گلاں باتاں کیتیاں۔ جدوں تھک گئے تے اپنے خاص کارنر کیفے توں جا کے سموسے تے گرما گرم چائے پیتی۔ چائے دے دوران اسیں اپنے جماعت دے متراں نال کھیڈے گئے مذاق نوں یاد کر کے بہت ہنسے۔ فیر اپنے اساتذہ دیاں کہانیاں وی اِک دوجے نوں سنائیاں۔

جدوں ساڈی پیٹ پوجا ختم ہوئی تے اسیں اپنے پرانے محلے دا چکر لگان نکل کھڑے ہوئے، جتھے اسیں وڈے ہوئے سی۔ اوتھے اسیں خاص طور تے اوس شجر تک گئے جتھے اساں متراں دے ناں کڈھے ہوئے سی۔ فیر سانوں اپنی تمام پرُانیاں حرکتاں یاد آ گئیاں۔ اسیں آئس کریم ٹرک دا پچھا کردے کردے اوہ شور کردے کہ پورا محلہ جاگ جاندا اتے سانوں بُرا بھلا آکھدا۔ ایس سب ہنسی مذاق دے وچکار سانوں اِک احساس وی ہو رہیا سی کہ جاندا ویلا فیر دوبارہ ہتھ نہیں آندا۔ ایتھے اسی جناں وی ماضی نوں یاد کر لیئے، اوہ ویلا فیر مڑے گا نہیں۔ پر

ایہہ دن بہت خاص سی کیونکہ ایس دے کولوں اسی فیر پرانی یاداں دے وچکار آ گئے سی، تے ایس دن نے سانوں پرانے دناں دی یاد دلادتی سی جو اساں دا قیمتی سرمایہ اے۔

سورج ڈبن کولوں اسیں واپس یونیورسٹی اپڑے۔ میں نے اپنے متراں نوں رب راکھا آکھیا تے واپس اپنے ہوسٹل لوٹ آئی۔

اچھا اب کل گل کراں گے۔

رب راکھا!

اج دے دن بہت زیادہ رُجھاں سی۔ یونیورسٹی وچ کلاساں، لیکچر تے اسائنمنٹ ہوندے ہوندے لنگھ گیا۔ سون دا ویلا وی نہیں ملیا۔ پر اج سبھ کماں وچکار اِک سکون دا پہلو وی سی۔ شام نوں اِک سکھی نے افطار پارٹی دا سندیسہ دتا سی۔

ہوسٹل آن دے بعد میں کجھ ویلے آرام کیتا۔ فیر جیویں مغرب دا ویلا نیڑے آیا، میں تیار ہو کے اپنے متراں دے کول اپڑی۔ اسیں مل کے پارٹی دین والی سکھی دے گھر اپڑے۔ افطار پارٹی بہت مزے دی سی۔ اوہدا دستر خواں سوادی تے انوکھے، پکواناں نال بھریا پیا سی۔ سموسے تے پکوڑے، دُدھ، دہی لسّی، سویاں، غرض ہر شے پچھلی نالوں ودھ لبھاؤن والی سی۔

کھانے نالوں ودھ کے سبھ سکھیاں دا اِک تھاں مِل بیٹھنا زیادہ سوادی سی۔ یونیورسٹی وچ اِک دوجے نال نرا کم دیاں گلاں ہی ہوندیاں سی۔ ایتھے اسیں کھلے ڈلے زندگی دے ہر بکھیڑے اتے گلاں باتاں کر رہے سی تے ہنسی مذاق وچ رجھ گئے سی۔ ایہہ ملاپ ساڈا ایسا سی جیہا آخری ہوئے۔

جیویں ہی رات پے گئی تے اسمان تے انھیرا ہو گیا، میں تے اپنے اوپر سکون دا احساس محسوس کیتا۔

جیون دیاں رُجھاں دے وچکار ایس طرحاں دے پلاں نے ہولی ہون تے زندگی دیاں سادہ خُشیاں دا شکر ادا کرن دی اہمیت سکھائی۔

فیر جدوں میں گھر نوں ونجی، میں جاندی سی کہ ایس شام دیاں یاداں سدا میرے نال رہن گئیاں۔ اج مینوں سچ مچ بہت مزا آیا!

اچھا اب کل گل کراں گے

رب راکھا!

❋ ❋ ❋

رفیعہ شکیل

میری پیاری ڈائری

اَج ۲۴ مارچ سی۔ عام دناں دے برعکس اَج دا دن بڑا مختلف سی، اِس دا آغاز سویرے ۳ وجے ہویا۔ جدوں میری دوست نے مینوں سحری واسطے جگایا۔ گھر توں دور رمضان اوکھا اے پر دوستاں نال گزارن داوی وکھرا ای مزہ تے تجربہ اے۔ نیندر وجھوں بُرے حال وچ PDC پہنچے، جتھے اَج پراٹھے گرم تے تازہ ملے، ساڈی تے سمجھو عید ہو گئی۔

سحری دے بعد نماز پڑھ کے میں سوں گئی۔ پورے ہفتے دی تھکاوٹ دی وجہ توں فیر اکھ ۱۲ وجے کھُلی۔ جَدوں امّی دی کال آئی۔ اٹھدے نال خیال آیا جو اَج اپنی فیکلٹی ایڈوائزر نال ملاقات سی۔ ملاقات بڑی مفید تے موئثر رہی جیہدے وچ میں میم توں بہت کجھ سکھیا۔ ایس دے بعد مسجد وچ ظہر دی نماز ادا کیتی۔ ایہہ مسجد میرا لمز داسب توں پسندیدہ حصّہ اے۔

جیویں ای میں ہوسٹل پہنچی، اگے میریاں دوستاں نے جلدی تیار ہونے دا رولا پایا سی۔ اَج اسی اندرون شہر جان دا پلان بنایا ہویا سی۔ ہوسٹل دی زندگی دا ایہہ حصّہ میرا ای نہیں، سب دا پسندیدہ ہوندا ہے۔ ایہناں یاداں نال بندہ فیر اپنی عملی زندگی وچ داخل ہوندا اے۔

اپنی پسندیدہ شلوار قمیص تے جُھمکے پاون دے بعد دوستاں نال اندرون لاہور دارُخ کیتا۔ ایہہ راستہ گھنٹے دا سی، لیکن دوستاں نال گلاں کردے ہوئے ایہدا پتا ای نہیں لگیا۔ رستے وچ لاہور دے ہور مشہور تے خوب صورت کالجز تے یونیورسٹیاں وی نظر آئیاں جیویں "Government College University" تے

"National College of Arts"

پہنچدے نال اَسی جنون ہوٹل دا رُخ کیتا۔ جتھے میری دوست نے رُوف ٹاپ تے بکنگ کرائی ہوئی سی۔ ساڈے اوتھے پہنچدے نال افطاری دا سائرن بجیا۔ ہوٹل دے سٹاف نے فٹافٹ سب نوں ٹھنڈا جام شیریں پیش کیتا۔

روزہ افطار کرن دے بعد جدوں حواس ٹھیک ہوئے تاں نظر خوب صورت بادشاہی مسجد تے پئی، جیہنوں ویکھ کے انسان حیرت زدہ رہ جاندا اے۔ لمز وچ ایڈ مشن لیاں دو برس بیتے نیں لیکن کدی اندرون لاہور جان دا اتفاق نہ ہویا سی۔ بہر حال اوتھے دی پُر امن ہوا تے سکون وچ بیٹھ کے کھانے دا اپنا ہی مزہ سی۔ رُوف ٹاپ دے دلفریب نظارے تے پُر لطف ہوا دی وجہ توں کڑاہی تے نان دا مزہ دوبالا ہو گیا سی۔

اِس توں بعد اَسی تھلے جا کے باقی دیاں تھاواں پھرن دا ارادہ کیتا۔ اِک خوب صورت گلی، جیہدے وچ حویلی تے مختلف دُکاناں سن، ایتھوں ہو کے اسی بادشاہی مسجد دے اندر ٹُر گئے۔ اِس دے بر آمدے دے وچ تراویاں ہو رہیاں سن۔ اوتھے دی خوب صورتی تے سکون نال لُطف اندوز ہون بعد تے کجھ لمحے تصویراں وچ محفوظ کرن بعد اسی واپس جانے دا ارادہ کیتا۔ اوبر منگان توں پہلاں اسی اِک دُوکان توں چاہ پیتی جس دا اپنا ہی مزہ سی۔

واپسی دا رستہ ایہناں شاہکار عمارتاں دے بارے سوچدے بیت گیا۔ تھکاوٹ توں بُرا حال ہو جاون وجھوں واپسی پہنچدے نال میں اپنا ایہہ سوہنا تجربہ اپنی اس پیاری ڈائری وچ محفوظ کیتا۔ اَج دا دن اس لئی اک خوب صورت یاد گار رہیا۔

آخر تے بس میں اپنی اِک ہور سوچ نوں قلم بند کرنا چاہندی آں اِس ہفتے ساڈی پنجابی دی کلاس وچ اِک پنجابی دے مشہور تے انقلابی شاعر بابا نجمی آئے سن۔ اوہناں دا اِک شعر مینوں اندرون شہر توں ڈی ایچ اے

دے سفر وچ بہت یاد آیا۔ اوہ کجھ اِس طرح اے کہ:

اکو تیرا میرا پیو، اکو تیری میری ماں
اکو ساڈی جنم بھوں
توں سردار میں کمی کیوں؟

(بابا نجمی)

اس دے نال میں اپنے اَج دے دن دا اختتام کر دی آں۔

ربّ راکھا

اَج دا دن وی روز جیہا دن سی۔۔ جیہڑا نہ صرف میرا اسگوں ہر طالب علم دا بڑا ناپسندیدہ دن ہوندا ہے۔ اتوار والے دن اندرون لاہور دی سیر کر کے بڑا مزہ آیا اے۔ پر اَج دیاں کلاساں لینیاں اوکھیاں لگ رہیاں سن۔ اَج دے دن دا آغاز وی سحری نال ہی ہویا۔ اَج سحری PDC دے بجائے ذاکر تکہ توں کیتی۔ دیسی کھانے دے حساب نال ایہہ لمز وچ سب توں ودھیا جگہ اے۔ خاص کر کے ایہناں دا پراٹھا آملیٹ بہت چنگا ہوندا اے۔

سحری کرن توں بعد فجر پڑھ کے میں سوں گئی، لیکن اَج صرف ۳، ۲ گھنٹے سو کے اٹھ گئی۔ ۸ وجے Intro to Policy دی کلاس سی۔ میری توبہ اَج توں بعد کدے وی اِس وقت دی کلاس لواں۔ اس توں بعد دو گھنٹے دا وقفہ سی، جیہدے وچ میں اگلی کلاس دا ٹیسٹ تیار کیتا۔

اِس توں بعد Anthropology دی کلاس ہوئی، جیہدے وچ اَج اَسی بڑے منفرد تے دل چسپ لوکاں بارے پڑھیا اے۔ جو سوڈان وچ بسدے سن۔ جیہناں نوں "Neur" کہیا جاندا اے۔ ایہناں دے ہاں

بیل تے انسان دا اک درجہ ہوندا اے۔ ایہہ لوک بیل نوں خُدا تک رسائی دا ذریعہ مندے ہین۔ ایہہ مضمون میرا سب توں پسندیدہ اے۔ اِس دے وچ انسان نہ صرف دوجے لوکاں بارے سکھدا اے سگوں ایہہ انسان دے وچ اِک دوجے نال رواداری نال پیش آن دا جذبہ وی پیدا کردا اے۔ دن بھر کلاساں لے کے سہ پہریں ہاسٹل پہنچی۔ تھکاوٹ دی وجہ توں سوں گئی۔ افطار کرن واسطے اَج دوستاں نال Jammin گئی۔

افطار توں بعد میری دوست فاطمہ دی کال آئی۔ اَسی لمز وچ E-Bike چلان دا ارادہ کیتا۔ ویکھنے وچ جنی چلان لئی اسان اوہ لگ رہی سی، اونی اوکھی سی۔ توازن برقرار رکھنا سب توں مشکل کم سی۔ بہر حال بہت کوششاں توں بعد تھوڑی بہت چلانی آ گئی۔ اس اِک چھوٹی جنی سرگرمی توں وی مینوں زندگی دا سبق ملیا کہ کوشش کرن نال سب ممکن ہوندا اے تے انسان ہاردا اس وقت اے جدوں اوہ اپنی ہار آپ من لوے۔

Bike چلانے دے بعد اسی چاہ پیتی تے فیر ہوسٹل پڑھائی کرن واسطے ٹُر گئے۔ ایس طرح میرے اَج دے دن دا اختتام ہویا۔ ایہہ سی میری اَج دی ڈائری۔

ربّ راکھا

اَج پندرھواں روزہ سی، ادّھا رمضان لنگھ وی گیا تے پتا وی نہ چلیا۔ گھر جان دے وی دن قریب آ رہے سن۔ ایہہ سوچ کے وی بڑی خوشی ملدی اے۔

اِس دن دا آغاز وی سحری توں ہویا۔ ذاکر تکہ توں ودھیا پراٹھا آملیٹ کھایا۔ فجر دی نماز ادا کرن بعد اَج سونے دی بجائے تھوڑی چہل قدمی کرنے دا ارادہ کیتا۔ ایہہ نہ صرف انسان دی صحت واسطے مفید ہوندا اے سگوں ذہنی دباؤ نال نبڑن وچ وی مدد کردا اے۔

اِس توں بعد میں سوں گئی۔ اکھ ۹ وجے کھُلی جدوں امی دی کال آئی۔ اُٹھدے نال ہی پنجابی دی کلاس دا

سبق دوہرایا۔ اَج پنجابی دی کلاس وچ اسی جنوبی پنجاب دے نمایاں شاعر شاکر شجاع آبادی بارے پڑھیا۔ اسی ایہناں دے مختلف دوہڑے وی پڑھے جیویں:

جیویں میکوں آن رُوایا ہئی اینویں میں وانگوں پَل پَل روسیں
ہک واری رو کے تھک بہسیں وَل دل ڈُکھسیا توں ول رو سیں
نہ ڈُکھڑے آن ونڈیسیا کوئی، توں لا کندھیاں کوں گل روسیں
بس شاکرؔ فرق معیاد دا ہے مَیں اَج روندااں تو کل روسیں

ایہناں دی شاعری اپنی مثال آپ اے۔ ایہناں اپنی جسمانی معذوری نوں اپنے اُتے غالب نہ آن دتا۔ ایس وجھوں سب دے لئی اپنی مثال آپ نیں۔ پنجابی دی کلاس توں بعد Operation تے فیر Business Communication دی کلاس لئی Business Communication وچ اَج میم نے ساڈے کولوں بغیر تیار کیتے فوری Presentations کرائیاں۔ ایہہ وی اج دے دور دے حساب نال اک ضروری مہارت اے۔

افطاری Juice Zone توں کرن بعد مینوں اپنی دوست دی کال آئی۔ اسی کافی پین داارادہ کیتا۔ فیر DHA Phase 6 Raya دارُخ کیتا۔ اوتھوں کافی توں لطف اندوز ہو کے اسی لمز کوئی ۹ وجے دے قریب پہنچے۔ اپنے اگلے دن دا ٹیسٹ تیار کیتا تے ایس طرح میرے اَج دے دن دا اختتام ہویا۔ ایہہ سی میری اج دی ڈائری۔

ربّ راکھا

***

فارسی

معروف مهدی

تجربه من در کلاس زبان فارسی

من در دانشگاه لمز زبان فارسی می خوانم این کلاس برای من جالب و مفید است۔ معلم ماء خانم تمینه عارفه، خیلی مهربان و کمک کننده هستند دستیار تدریس، آقای عاقب ارشاد، هم همیشه به ما کمک می کند۔ من از آن هاخیلی تشکر می کنم

این تنها کلاس است که من ددطول هفته منتظرش هستم من یاد گیری زبان فارسی راخیلی دوست دارم۔

در این کلاس، من زمان های حال و گذشته فارسی را یادگرفتم۔ مااعداد فارسی راهم یاد گرفتیم و من می توانم ازیک تاصد بشمارم۔ مادرباده رنگ ها، غذا های ایرانی و شهر های ایران هم یاد گرفتیم همچنین با شهر های مثل تهران، اصفهان و شیراز آشنا شدیم۔

ماشعر ای بزرگ مثل حافظ و سعدی و تاریخ ایران راهم مطالعه کر دیم۔ این بخش خیلی جالب و مفید بود به طور کلی، این کلاس برای من یک تجربه عالی است۔ من فارسی یاد کرفته ام و دربار فرهنگ ایران هم چیز های زیادی فهمیدم۔ امید وادم فارسی را بیشتر یاد بگیرم۔

فارسی زبان کی کلاس میں میرا تجربہ

اُردو ترجمہ:

میں لمز یونیورسٹی میں فارسی زبان سیکھ رہا ہوں۔ یہ کلاس میرے لئے بہت مفید اور دل چسپ ہے۔ ہماری استاد ثمینہ عارفہ صاحبہ بہت مہربان اور مدد کرنے والی ہیں۔ ہماری کلاس کے معاون محترم عاقب ارشاد صاحب بھی ہماری مدد کرتے ہیں۔ میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ یہ ہماری واحد کلاس ہے جس کا میں پورے ہفتے منتظر رہتا ہوں۔ میں فارسی زبان کو سیکھنے میں بہت دل چسپی رکھتا ہوں۔

اس کلاس میں ہم نے زمانِ حال اور گذشتہ سیکھ لیے ہیں۔ اس کے علاوہ اعداد بھی سیکھے ہیں اور میں ایک سے سو تک گن سکتا ہوں۔ ہم نے ایرانی رنگوں، غذاؤں اور ایران کے معروف شہروں کے متعلق بھی پڑھا ہے۔ ہم نے ایرانی شہروں مثلاً تہران، اصفہان اور شیراز سے آشنائی حاصل کی ہے۔

ہم نے ایران کے بڑے شعرا مثلاً حافظ، سعدی اور تاریخ ایران کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے درس کا یہ حصہ بہت دل چسپ اور مفید تھا۔ مکمل طور پر یہ کلاس ہمارے لئے ایک بہترین تجربہ تھا۔ میں نے فارسی زبان سیکھی اور اس کے ساتھ ساتھ ایرانی ثقافت کے بارے میں بھی بہت سی معلومات حاصل کیں۔ امید کرتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ فارسی زبان سیکھ لوں گا۔

❋❋❋

محمد سلیمان رزاق

کلاس زبان فارسی

من زبان فارسی را دوست دارم۔ این درس بسیار آسان است۔ ابن درس بسیار جالب است۔ معلم ماخیلی خوب تدریس می کند۔ من خصوص از تم پن های گفتاری لذت می برم۔ آشنایی باشعروادبیات ایران عمیقاً به من انگیزه می دهد۔ تمر ین های تعالمی و بحث های گروهی درک مفاهیم را آسان تر می کند۔ من واقعا از این درس لذت می برم۔ من براحتی فارسی یادمی گیرم۔ معلم ما همه چیز را خوب توضیح ی دهد۔ من مشتاق ادامه یادگیری وارتقای مهارت خود هستم۔ برای عاشقان زبان فارسی این درس ارزش دارد۔

یادگیری زبان فارسی بر ای من یک تجربه ارزشمند است۔ من الان به زبان فارسی می توانم صحبت کنم۔ من به دوستانم گویم این درس رابخوانند۔

فارسی زبان کی کلاس

اُردو ترجمہ:

میں فارسی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اس کے اسباق بہت آسان ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔ ہماری استاد بہت اچھی طرح درس پڑھاتی ہیں۔ میں خاص طور پر اس کی مشقوں سے بہت لطف اٹھاتا ہوں۔ فارسی اشعار اور اس کا ادب مجھے بہت دلچسپ لگتا ہے۔ اس کی انفرادی مشقیں اور گروپس کے درمیان بحث ہمیں فارسی زبان کو سمجھنے کو آسان تر کر دیتی ہیں۔ حقیقت میں میں اس کے اسباق سے بہت لذت لیتا ہوں۔ ہماری استاد ہر چیز کی بہت اچھی طرح توضیح کرتی ہیں۔ میں اپنی فارسی زبان کی استعداد اور اس کو سیکھنے کے لئے اپنی استعداد کو بڑھانا چاہتا ہوں۔ فارسی زبان کے عشاق کے لئے یہ درس بہت زیادہ سود مند ہیں۔ فارسی زبان کو سیکھنا میرے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اب میں فارسی زبان میں بات چیت بھی کر سکتا ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ فارسی زبان ضرور سیکھیں۔

❋❋❋

محمد زین

مهربان دوست

من یار مهربانم
میں مہربان دوست ہوں

وانا و خوش بیانم
عقل مند اور اچھی گفتگو کرتا ہوں

گویم سخن فراوان
میں بہت بولتی ہوں (نصیحت) کرتی ہوں

باآنکه بی زبانم
حالانکہ بے زبان ہوں میں

پندت دهم فراوان
میں تمھیں بہت نصیحتیں کرتی ہوں

من یاریند دانم
میں بہت سی نصیحتیں جانتی ہوں

من دوستی هنرمند
میں تمھارا کارآمد دوست ہوں

باسودلی زیانم
فائدے کے ساتھ، بغیر کسی ضرر کے

از من مباش غافل
مجھ سے غافل نہ رہو

من پار مهر بانم
میں مہربان یار ہوں

وضاحت:

شاعر کتاب، ایک ایسی کتاب کے بارے میں لکھتا ہے جو خود کو سب کے لیے مفید سمجھتی ہے۔ گماں کرتی ہے کہ وہ ہر طور و طریقہ کے نقصان سے ماورا ہے۔ کتاب خود کو ایک مہربان رفیق بتاتی ہے کہ جیسے وہ نہایت دانشور اور تکلم کے پنہاں راز جانتی ہو۔ اور وہ ایسا نہ کرے تو کیوں؟ کہ وہ بہت نصیحتیں کرتی ہے اس

حقیقت سے بالاتر ہو کر کہ وہ بول نہیں سکتی۔ مگر آخر یہ کہہ اٹھتی ہے کہ مجھ سے غفلت کا رویہ نہ برتو، کہ میں تو تمہارے لیے فکر مند شخص کی مثل ہوں۔ اور براجمان احباب کتاب کے گماں کو بھولے سے محض گماں نہ تصور کر لیجیے گا۔ یہ تو عالم کی ایک سچی حقیقت ہے!

ہر اک قاری من یک مہرباں ہوں میں
دانشوری سے پُر، بہت خوش بیاں ہوں میں
کرتی ہوں بے شمار میں سب سے بات چیت
برعکس ان احوال کے اک بے زباں ہوں میں
میں ہوں بہت مفید اور نقصان سے بھی پاک
تمھارے حق میں دوست بہت کام کا ہوں میں
یوں نہ ہو مجھ سے غافل، کچھ بات کو سمجھو
ہر اک قاری من یک مہرباں ہوں میں
واعظ نہ مجھ سے بڑھ کے ہے جہاں میں کوئی
برحق ہے یہ سخن کہ وعظ جانتا ہوں میں

❁❁❁

سندھی

اشوک کمار

دوست ناهيان آهيان ساٿ

دوست ناهيان آهيان ساٿ
موت ناهيان آهيان ڪات

زبان ناهيان آهيان بات
اونداهہ ناهيان آهيان رات

جيون ناهيان آهيان حيات
صبح ناهيان آهيان پرڀات

عقل ناهيان آهيان ذات
ڳالهہ ناهيان آهيان وات

❁❁❁

ثنازاہد

سپني دوستن کي سلام

اميد آهي تہ توهان سڀ خيريت سان هوندؤ. توهان جي مهرباني جو توهان منهنجو مضمون پڙهڻ لاءِ چونڊيو

منهنجو نالو ثنا زاهد آهي ۽ مان سر اشوڪ ڪمار کتري جي شاگردياڻي آهيان. مون هي مضمون لکيو آهي. مون کي اميد آهي تہ اوهان کي پسند ايندو.

هن مضمون ۾، مان سنڌ ۽ سنڌي ٻولي جي تاريخ، ان جو آغاز ۽ ارتقا ۽ ان جي لهجن بابت ڳالهائيندس.

ان سان گڏ، مان سنڌي ثقافت، سنڌي مذهبن ۽ سنڌي ميلن بابت پڻ ڳالهائيندس.

سنڌ صوبي جو تعارف (Introduction to Sindhi Province)

سنڌ پاڪستان جي چار صوبن مان هڪ آهي. اهو ملڪ جي ڏکڻ

اوڀر واري حصي ۾ واقع آهي.
سنڌ جي اولهه ۾ بلوچستان، اتر ۾ پنجاب، اوڀر ۾ ڀارت جون رياستون راجسٿان ۽ گجرات آهن، ۽ ڏکڻ ۾ عربي سمنڊ آهي.
ان کي اڪثر "صوفين ۽ ولين جي ڌرتي" چيو ويندو آهي، ڇو ته ان جي مالامال تاريخ، ثقافت ۽ روحاني ورثي جي ڪري سنڌ جي گادي جو هنڌ ڪراچي، پاڪستان جو سڀ کان وڏو شهر ۽ اهم اقتصادي مرڪز آهي، جيڪو هڪ جاندار ۽ گهڻ رخا شهري ماحول فراهم ڪري ٿوسنڌ ۾ ڳالهائي ويندڙ ٻولي سنڌي آهي.
سنڌ هڪ ثقافتي جڳهه طور تمام پراڻي تاريخ رکي ٿي. ان جون پاڙون قديم سنڌو واس تهذيب سان ڳنڍيل آهن، جيڪا لڳ ڀڳ ٢٥٠٠ ۾ وڌي ۽ ڦهلي.
وقت سان گڏ، ڪيترين ئي سلطنتون ۽ ثقافتون سنڌ ۾ آيون، جن ۾ فارسي، يوناني، عرب، مغل ۽ برطانوي شامل آهن.
هن ڏگهي تاريخ سنڌ جي ٻولي، عمارتن ۽ روايتن تي وڏو اثر ڇڏيو آهي

سنڌ صوبي جي تاريخHistory of Sindh Province

سنڌ قديم سنڌو واس جي تهذيب جو هڪ اهم حصو هو، جيڪو دنيا جي قديم ترين تهذيبن مان هڪ آهي. هي تهذيب لڳ ڀڳ ٣٠٠٠ ۾ ابري ۽ لڳ ڀڳ ١٠٠٠ سال تائين جاري رهي. هن سنڌو واس تهذيب ۾ ڪيترائي اهم شهر هئا جيئن ته هڙپا، مهرڳڙه ۽ موهن جو دڙو.

ان وقت سنڌ به سنڌو واس جي تهذيب جو هڪ اهم حصو بڻجي وئي.

ان کان پوءِ، ۱۵۰۰ کان ۵۰۰ جي وچ ۾ آريا نالي ماڻهو هن علائقي ۾ اچڻ لڳا.

انهن آريا قبيلن نون خيالن کي آندو ۽ هڪ نئين ويدڪ تهذيب جي شروعات ڪئي. سنڌ پڻ هن ويدڪ تهذيب جو حصو بڻيو، جيڪو ۵۰۰ تائين برقرار رهيو. انهيءَ عرصي دوران اهم مذهبي ڪتاب، جن کي ويد چيو ويندو آهي، لکيا ويا

سنڌ جي تاريخ ۾، سنڌو دريا جي ڪناري ڪيترن ئي قديم مذهبي ۽ ادبي متون جي تخليق سان جڙيل آهي. ان ۾ هندو ڌرم جا چار اهم مذهبي ڪتاب رگ ويد، يجر ويد، سام ويد، ۽ اٿر ويد پڻ شامل آهن هي ويد سنڌو ماٿري جي تهذيب ۾ سنڌو دريا جي ڪنارن تي ترتيب ڏنا ويا هئا.

رشي ۽ منين ويد لکيا.

ان کان پوءِ سڪندر اعظم هن تهذيب تي حملو ڪيو ۽ سنڌ موريه سلطنت جو حصو بڻجي ويو.

جڏهن موريه سلطنت جو زوال ٿيو، ته ٻين گروهن جهڙوڪ انڊو-يوناني ۽ انڊو-پارٿهيا حڪمراني ڪئي.

سنڌ مسلمانن جي حڪمراني ۾ تڏهن آيو، جڏهن عربن هن تي قبضو ڪيو.

اٺين صدي ۾، محمد بن قاسم جي اڳواڻيءَ ۾ عربن سنڌ کي فتح ڪيو.

هنن اسلام آندو، جيڪو سنڌ جي ثقافت جو اهم حصو بڻجي ويو.

ان کان پوءِ ڪيترن ئي ڊائنسٽي سنڌ تي حڪمراني ڪئي. ۱۵۹۱ ۾، مغل سلطنت سنڌ کي فتح ڪري پنهنجي سلطنت جو حصو بڻايو. بعد ۾، ٽالپور ڊائنسٽي سنڌ تي حڪمراني ڪئي.

انگريزن حيدرآباد جي جنگ ۾ ٽالپور ڊائنسٽي کي شڪست ڏني ۽ سنڌ جو ڪنٽرول حاصل ڪيو. ۱۹۳٦ع ۾ سنڌ هڪ الڳ صوبو بڻيو. ۱۹۴۷ع ۾ برصغير جي ورهاڱي کان پوءِ سنڌ پاڪستان جو حصو بڻجي ويو انهي ڪري سنڌ کي باب الاسلام بہ چيو ويندو آهي

سنڌي ٻولي ۽ ان جي تاريخ (Sindhi language and its history)

سنڌي هڪ تمام پراڻي ٻولي آهي جيڪا پاڪستان جي صوبي سنڌ ۾ ڳالهائي وڃي ٿي.

هندستان ۽ ٻين ملڪن ۾ پڻ سنڌي ماڻهو هيءَ ٻولي ڳالهائين ٿا.

سنڌي پاڪستان جي قديم ترين ٻولين مان هڪ آهي، جنهن جي تاريخ هزارين سالن کان هلي ٿي

سنڌي ٻوليءَ جو ارتقا ۲۴۰۰ سالن جي عرصي ۾ ٿيو.

سنڌي ٻوليءَ جو آغاز قديم سنڌو واس تهذيب ۾ لڳ ڀڳ ۳۰۰۰ ۾ ٿيو، جيڪا دنيا جي قديم ترين تهذيبن مان هڪ آهي.

جيتوڻيڪ سنڌو واس جي ماڻهن جي ٻولي اڃا تائين سمجهي نه وئي آهي، پر ڪيترائي ماهر مڃين ٿا ته سنڌي شايد پراڪرت ٻولين مان ارتقا پذير ٿي، جيڪي هن تهذيب جي زوال کان پوءِ پيدا ٿيون

آريا جي حملي کان پوءِ، سنڌي ٻولي تي سندن ٻولي سنسڪرت ۽ پراڪرت جو اثر ٿيو.

سنڌ جي اهم اسٽرٽيجڪ جڳهه جي ڪري، سنڌ تي بار بار يوناني، عرب، ترڪ ۽ مغل حملو آور آيا.

انهن حمله آورن پنهنجيون ٻوليون آنديون، جن جو اثر سنڌي ٻولي تي ٿيو. سنڌي ٻوليءَ ۾ فارسي، عربي، هندي، ترڪي، ۽ ايتري قدر جو پرتگالي ٻوليءَ جا لفظ ۽ اثر شامل ٿيا.

CE۷۱۱

۾ عربن جي فتح کان پوءِ سنڌ ۾ اسلامي ثقافت ۽ عربي رسم الخط جو تعارف ٿيو، جنهن سنڌي جي لفظن ۽ رسم الخط تي اثر ڇڏيو. وچين دور تائين، سنڌي ٻوليءَ پنهنجي هڪ رسم الخط اختيار ڪئي، جيڪا عربي رسم الخط جي هڪ تبديل ڪيل صورت تي ٻڌل هئي ۽ اڄ به استعمال ٿئي ٿي

Views of Certain Scholars

جرمن عالم ڊاڪٽر ارنسٽ ٽرمپ پهرين ماهرن مان هو جن سنڌي ٻوليءَ

جو مطالعو ڪيو.

هن تجويز پيش ڪئي ته سنڌي سڌو سنسڪرت مان نڪتل آهي ۽ ان کي "خالص سنسڪرت جي متاثر ٿيل ٻولي" قرار ڏنو، جنهن تي ٻين اتر ڀارتي ٻولين جي ڀيٽ ۾ غير ملڪي اثر گهٽ آهن.

ٽرمپ جي هن نظريي هڪ بحث کي جنم ڏنو ته ڇا سنڌي سنسڪرت مان پيدا ٿي يا الڳ ترقي ڪئي پر ان تي سنسڪرت جو اثر رهيو

صور تخطي(Sindhi Script)

سنڌي کي مختلف صور تخطي ۾ لکيو ويو آهي. اڄڪلهه عربي-سنڌي ۽ ديوناگري-سنڌي سڀ کان وڌيڪ مشهور آهن. برصغير جي ورهاڱي کان پوءِ اڳ، سنڌي سنڌ صوبي ۾ ڳالهائي ويندي هئي.

١٩٤٧ جي ورهاڱي کان پوءِ ، پاڪستان ۾ سنڌي ڳالهائيندڙ عربي صور تخطي استعمال ڪن ٿا، جڏهن ته ڀارت ۾ سنڌي ڳالهائيندڙ ديوناگري صور تخطي استعمال ڪن ٿا

Dialects

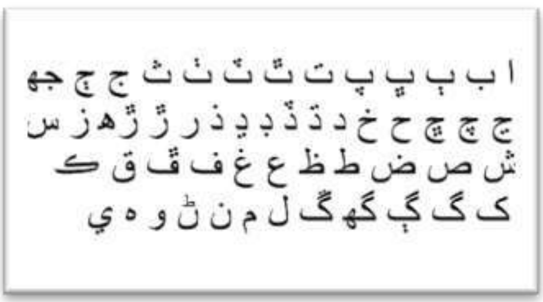

سنڌي ٻوليءَ جا ٦ لهجا آهن:

سرايڪي
وچولي
لاڙي
لا سي
ٿري
ڪڇي

سنڌي ماڻهن جا مذهب(Religion of Sindhi People)

برصغير جي ورهاڱي کان پوءِ اڳ سنڌي ماڻهو امن سان گڏ رهندا هئا. اڄ پاڪستان ۾ رهندڙ اڪثر سنڌي مسلمان آهن، جڏهن ته اقليتون عيسائي، سک ۽ هندو آهن.

ورهاست دوران ڪيترائي سنڌي ڀارت لڏي ويا. ڀارت ۾ رهندڙ اڪثر

سنڌي هندو آهن. پاڪستان ۾ ٨ سيڪڙو سنڌي هندو آهن ۽ باقي مسلمان آهن.

سنڌي ماڻهو ۽ سندن ثقافت(Sindhi people and culture)

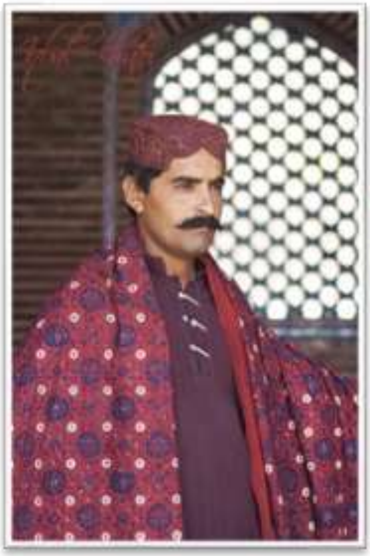

سنڌي ماڻهو پاڪستان جي آبادي جو لڳ ڀڳ ٢٣ سيڪڙو آهن، جيڪي گهڻو ڪري سنڌ صوبي ۾ رهن ٿا سنڌي ماڻهن جي ثقافت تمام مالا مال آهي، جيڪا هنن جي طويل تاريخ ۽ مختلف اثرن سان ٺهي آهي.

اهي ماڻهو پنهنجي گرم جوشي ۽ مهمان نوازي لاءِ مشهور آهن. سنڌي ميوزڪ، ناچ، ۽ ميلن سان پيار ڪن ٿا، ۽ اڪثر صوفي روايتن سان جشن ملهائين ٿا سندن هنر ۾ رنگين اجرڪ جا ڪپڙا، مٽي جا ٿانو، ۽ نفيس پرت شامل آهن سنڌي لباس خوبصورت ۽ منفرد آهي. عورتون روايتي پرت وارا ڪپڙا پائين ٿيون، ۽ مرد عام طور تي شلوارِ قميص پائين ٿا سنڌي اجرڪ هڪڙي شال آهي جنهن تي نيري ۽ ڳاڙهي گلن جا نمونا هوندا آهن، جيڪي مرد ۽ عورتون ٻئي پائين ٿا، ۽ سنڌي ٽوپي پڻ هڪ مقبول ثقافتي شيءِ آهي سنڌي کاڌو مزيدار آهي، جنهن ۾ سنڌي برياني ۽ ساين پاچين جهڙا مشهور کاڌا شامل آهن سنڌي ماڻهو اسلامي ۽ هندو روايتن پنهي کي اپنائن ٿا ۽ امن ۽ ثقافت جي فخر کي اهم سمجهين ٿا.

سنڌي تهوار(Sindhi festivals)

سنڌي ماڻهن جا ڪيترائي مشهور ميلا آهن جن ۾ لاهوتي چيٽي چنڊ، ڏياري، هولي، ۽ تيجري شامل آهن.

سنڌي مسلمان عيد الفطر ۽ عيد الاضحی ملهائين ٿا

سنڌي ماڻهو هر ميلو خوشي ۽ جوش سان گڏجي ملهائين ٿا

لاهوتي Sindhi Cultural Festival (Lahoti)

لاهوتي ميلو سنڌ ۾ هر سال ٿيندڙ هڪ ثقافتي ميلو آهي هن ميلي ۾ سنڌي ثقافت کي موسيقي، رقص، شاعري ۽ روايتي فنن ذريعي ملهائيو وڃي ٿوميلي

جو مقصد سنڌي روايتن کي زنده رکڻ ۽ سنڌي سڃاڻپ ۾ فخر محسوس ڪرائڻ آهي سيف سميجو، جيڪو هڪ مشهور سنڌي موسيقار آهي، هن ميلي کي مقامي فنڪارن جي مدد ۽ پروموشن لاءِ شروع ڪيو پاڪستان جي هر ڪنڊ ڪان ماڻهو اچن ٿا ته جيئن سنڌي موسيقي، آرٽ ۽ دستڪاري مان لطف اندوز ٿي سگهن ميلي ۾ پرفارمنس، شاعري، آرٽ جا نمائشون ۽ سنڌي کاڌن ۽ دستڪاري جا اسٽال شامل هوندا آهن هي هڪ گڏجاڻي آهي، جتي مقامي ماڻهن ۽ مهمانن کي سنڌي ورثي مان لطف اندوز ٿيڻ جو موقعو ملي ٿو

سنڌي هندو جا تهوار(Sindhi Hindu Festivals)

چيٽي چنڊ (Cheti Chand)

چيٽي چنڊ سنڌي ماڻهن لاءِ هڪ اهم تهوار آهي.

اهو سنڌي نئين سال جي شروعات کي ظاهر ڪري ٿو ۽ سندن سرپرست بزرگ جهوليلال جي عزت ۾ ملهايو ويندو آهي.

جهوليلال کي سنڌي برادري جو محافظ سمجهيو ويندو آهي.

هي تهوار عام طور تي مارچ يا اپريل ۾ ايندو آهي، جڏهن هندو مهيني چيتر جي شروعات ٿيندي آهي.

سنڌي چيٽي چنڊ کي دعائن، موسيقي، ۽ رقص سان گڏ ملهائين ٿا.
خاص دعائون مندرن ۽ ڪميونٽي گڏجاڻين ۾ ڪيون وينديون آهن.
ماڻهو روايتي سنڌي کاڌا ۽ مٺايون تيار ڪري پنهنجن گهر وارن ۽ دوستن سان ونڊيندا آهن.
هڪ رسم "پرانو صاحب" جي نالي سان ادا ڪئي ويندي آهي، جنهن ۾ پاڻي جي ماڳ وٽ گل، ڏيئا ۽ دعائون پيش ڪيون وينديون آهن.
چيٽي چنڊ جو موقعو سنڌين کي گڏجڻ، جشن ملهائڻ ۽ ايندڙ سال لاءِ برڪتون گهريندي گڏ ٿيڻ جو وقت آهي.

ڏياري (Diwali)

ڏياري سنڌي ماڻهن، خاص طور تي هندو برادري لاءِ هڪ وڏو تهوار آهي.
ان کي "روشنيءَ جو تهوار" به سڏيو ويندو آهي.
ڏياري روشنيءَ جي اونداهيءَ تي ۽ چڱائيءَ جي بُرائيءَ تي فتح کي ظاهر ڪري ٿي.
سنڌي ماڻهو ڏياري تي پنهنجن گهرن ۾ ڏيئا ۽ ميڻ بتيون ٻاري خوشي ملهائيندا آهن.
اهي پنهنجا گهر رنگ برنگي رنگولين سان سينگاريندا آهن.
لڪشمي ديوي، جيڪا دولت ۽ خوشحالي جي ديوي آهي، لاءِ خاص دعائون ڪيون وينديون آهن.
خاندان مٺايون ۽ روايتي کاڌا تيار ڪري پنهنجي پيارن سان ونڊيندا آهن.
خوشي ۽ جشن جي علامت طور ڦٽاڪا ڦاڙي ڪئي ويندي آهي.
ڏياري جو وقت سنڌي خاندانن لاءِ گڏجڻ، جشن ملهائڻ ۽ برڪتن جي طلب ڪرڻ جو وقت آهي

هولي(Holi)

هولي هڪ مشهور تهوار آهي جيڪو سنڌي خاص طور تي هندو

برادري ۾ ملهايو ويندو آهي.

ان کي "رنگن جو تهوار" پڻ سڏيو ويندو آهي.

هي بهار جي شروعات ۽ چڱائيءَ جي بُرائيءَ تي فتح کي ظاهر ڪري ٿو.

ماڻهو هولي کي هڪ ٻئي تي رنگين پائوڊر ۽ پاڻي اڇلائي ملهائين ٿا.

سنڌي خاندان، خاص طور تي هندو برادري، خوشي ۽ جوش سان هولي ملهائين ٿا.

گجيا جهڙيون روايتي مٺايون تيار ڪيون وينديون آهن ۽ پيارن سان ونڊيون وينديون آهن.

هولي ماڻهن کي گڏ آڻي معافي، محبت ۽ خوشي کي فروغ ڏئي ٿي.

موسيقي، رقص، ۽ خوشيءَ جون گڏجاڻيون هولي جي جشن جو وڏو حصو آهن.

اهو وقت آهي جو خاندان ۽ دوست گڏ ٿين ٿا ۽ پنهنجن رشتن کي مضبوط ڪن ٿا.

تيجري(Teejri)

تيجري هڪ روايتي تهوار آهي جيڪو سنڌي هندو عورتون ملهائين ٿيون.

هي تهوار شو ديوتا ۽ پاروتي ديوي جي نذر ڪيو ويو آهي. عورتون تيجري پنهنجي مڙسن جي صحت ۽ ڊگهي حياتي لاءِ ملهائين ٿيون.

ڪنواريون عورتون ورت پڻ رکن ٿيون ۽ بهترين مستقبل جي مڙس لاءِ دعا ڪن ٿيون.عورتون سخت روزو رکن ٿيون، اڪثر بغير پاڻي پيئڻ جي.

شام جو، عورتون گڏجي دعا ڪرڻ ۽ شو ديوتا ۽ پاروتي ديوي جي پوڃا ڪرڻ لاءِ گڏ ٿين ٿيون.

اهي پڇن ڳائين ٿيون ۽ ديوي ۽ ديوتا جي ڪهاڻيون شيئر ڪن ٿيون.

عورتون خوبصورت روايتي ڪپڙا، چوڙيون، زيور پائين ٿيون ۽ هٿن تي مهندي لڳائين ٿيون.

تيجري عورتن کي گڏ آڻي ٿو، جتي اهي دعا ڪن ٿيون، ڪهاڻيون ٻڌن ٿيون ۽ پنهنجو تهوار ملهائين ٿيون.

سنڌي مسلمانن جا مذهبي تهوار (Sindhi Muslim festivals)

عيد الفطر(Eid ul Fitar)

عيد الفطر سنڌي مسلمانن ۽ سڄي دنيا جي مسلمانن طرفان ملهايو ويندو آهي. هي رمضان جي مهيني جي پڄاڻي جي نشاني آهي، جنهن ۾ روزا رکڻ ۽ عبادت ڪئي ويندي آهي.

عيد جي ڏينهن تي ماڻهو صبح سوير اٿن ٿا ۽ نوان يا صاف ڪپڙا پهرين ٿا.هو خاص عيد جي نماز پڙهڻ لاءِ مسجد ويندا آهن ۽ الله جو شڪر ادا ڪندا آهن.

نماز ڪانپوءِ ماڻهو هڪٻئي کي "عيد مبارڪ" چون ٿا، جنهن جو مطلب آهي "عيد مبارڪ هجي."

ڪتب ۽ دوست هڪٻئي جي گهر ويندا آهن ۽ مٺايون ۽ روايتي سنڌي کاڌا جيئن برياني، ساڳ، ۽ مٺائي حصيداري ڪندا آهن.

تحفا خاص طور تي ٻارن لاءِ ڏنا ويندا آهن جيڪي جشن جو حصو هوندا آهن.

زڪاة الفطر (خيراتي) ڏني ويندي آهي ته جيئن ضرورتمند ماڻهو به عيد جو لطف حاصل ڪري سگهن.

سنڌي مسلمانن لاءِ عيد خوشي، اتحاد ۽ شڪر جو وقت آهي.

اهو خاندانن کي گڏ ڪري ٿو، خوشگوار يادون ٺاهيندو آهي ۽ الله جي نعمتن جو احترام ڪيو ويندو آهي

عيد الاضحی(Eid ul Azah)

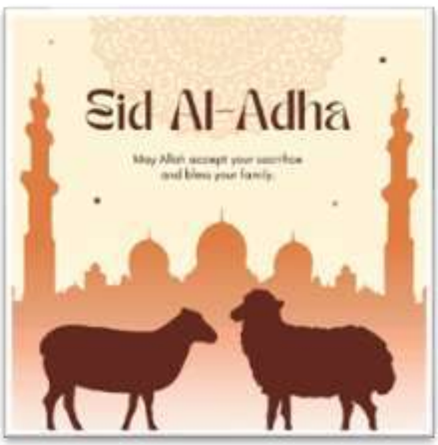

عيد الاضحی، جنهن کي "قرباني جو عيد" چيو ويندو آهي، سنڌي مسلمانن ۽ سڄي دنيا جي مسلمانن طرفان ملهايو ويندو آهي-

هي حضرت ابراهيم عليه السلام جي فرمانبرداري کي ياد ڪرڻ لاءِ ملهايو ويندو آهي، جڏهن هن پنهنجي پٽ کي الله جي حڪم تي قربان ڪرڻ لاءِ تيار ڪيو

الله حضرت ابراهيم جي پٽ جي جاءِ تي هڪ جانور عطا ڪيو، تنهنڪري عيد الاضحی تي مسلمان جانور جهڙوڪ بڪرا، ڳئون، يا اونٺ قربان ڪندا آهن

ڏينهن جي شروعات خاص عيد نماز سان ٿيندي آهي، جتي ماڻهو گڏ ٿي الله جو شڪر ادا ڪندا آهن.

نماز کان پوءِ خاندان جانور قربان ڪندا آهن، حضرت ابراهيم جي ايمان ۽ فرمانبرداري کي ياد ڪرڻ لاءِ

قرباني جو گوشت ٽن حصن ۾ ورهايو ويندو آهي: هڪ خاندان لاءِ، هڪ دوستن ۽ عزيزن لاءِ، ۽ هڪ ضرورت مند ماڻهن لاءِ.

سنڌي خاندان هڪٻئي جي گهر وڃن ٿا، عيد مبارڪ چون ٿا ۽ روايتي کاڌا جهڙوڪ برياني، ڪباب ۽ مٺائي حصيداري ڪندا آهن ضرورت مند ماڻهن جي مدد ڪرڻ ۽ کاڌو ورهائڻ عيد الاضحى جو اهم حصو آهي

سنڌي مسلمانن لاءِ عيد الاضحى وفاداري، ورهاست، ۽ گڏيل خوشي جو وقت آهي، جيڪو خاندانن ۽ دوستن کي جشن ۾ گڏ ڪري ٿو

Conclusion

سنڌي تہوار روشن تقريبون آهن جيڪي سنڌي ماڻهن جي ثقافتي ورثي ۽ روايتن کي ڏيکارين ٿيون۔

هر تہوار، چاهي اهو لاهوتي چيٽي چنڊ ، ديوالي، ا، هولي عيد يا تيجري، ماڻهن کي زندگي جي خوشين ۾ گڏ ڪري ٿو۔

هنن جشنن ۾ رنگ، موسيقي، رسمن ۽ گڏجڻ جي مضبوط جذبي سان پرپور آهن، جيڪي خوشيءَ ۽ ثقافتي فخر جا لمحات پيدا ڪن ٿا۔

سنڌي تہوارن جي خوبصورتي انهن جي طاقت ۾ آهي جيڪا نسلن کي ڳنڍين ٿي، روايتن کي برقرار رکين ٿي ۽ ڪميونٽي اندر ناتا مضبوط ڪري ٿي، جيڪي انهن کي واقعي خاص ۽ ناقابل فراموش بڻائن ٿا۔

مهرباني۔ مون کي اميد آهي ته توهان کي هي مضمون پڙهڻ ۾ مزو آيو هوندو

❋❋❋

بلوچی

ظہیر بلوچ

بلوچی نظم: نیاز مری

ترجمہ و تشریح:

یہ دنیا ایک آزمائش کی جگہ ہے۔ اور ہر دوسرا شخص ایک مختلف آزمائش سے دوچار ہے۔ کوئی کھانے کے ایک نوالے کو ترس رہا ہے تو کوئی اپنی صحت اور سکون کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ یہ بے رحم دنیا کسی کو مفلسی میں رکھ کر آزما رہی ہے جہاں لوگ بدن ڈھانپنے کے لیے کپڑوں کی تلاش میں ہیں تو کسی کو اپنے محبوب کی ایک جھلک کے لیے آزما رہی ہے۔ غرض یہ کہ ہر شخص کسی نہ کسی طرح کی آزمائش میں مبتلا ہے۔ دوسری طرف کسی کو نت نئے آرائش و سہولیات کا سامان چاہیے تو کوئی دنیا کی ان رنگینیوں سے نجات چاہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کل کائنات غموں اور آزمائش سے گھری ہوئی ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ ایک انسان جس چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کسی دوسرے انسان کے لیے منزل مقصود ہو سکتا ہے۔ اس طرح پوری خلقت رو رہی ہے۔

عربی

محمد ندیم شاہ

خلیفہ اور بوڑھا آدمی

(عربی سے ترجمہ)

ایک دن خلیفہ اور اس کے وزیر نے ایک ستر سالہ بوڑھے آدمی کو دیکھا۔ وہ کھجور کی گٹھلی لگا رہا تھا تو خلیفہ نے اس سے سوال کیا کہ:

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ اس کھجور کی گُٹھلی کا پھل کھائیں گے ؟''

اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بہت سالوں کے بعد پھل دے گا۔

بُوڑھے آدمی نے جواب دیا:

''ہمارے بڑوں نے لگایا اور ہم نے کھایا اور ہم لگاتے ہیں تاکہ ہمارے آنے والے کھائیں۔''

خلیفہ بوڑھے آدمی کی عقلمندی پر حیران رہ گیا۔ اور اس نے اُسے ۱۰۰ دینار دیے۔

بوڑھے آدمی نے دینار لے کر کہا: دیکھو خلیفہ، کھجور کا درخت پھل لایا ہے۔

عقلمند بوڑھے آدمی کی بات سن کر خلیفہ آگے بڑھا اور اُسے مزید سو دینار دے۔ پھر بوڑھے آدمی نے چہرے پر مسکراہٹ بھرتے ہوئے کہا کہ ہر پودا درخت سال میں ایک بار پھل دیتا ہے سوائے میرے پودے کہ جس نے دو بار پھل دیا ہے۔ اس پر خلیفہ کی تعریف بڑھ گئی اور اس نے وزیر کو مزید ۱۰۰ دینار ادا کرنے کا حکم دے دیا۔

خلیفہ اپنے وزیر کے پاس گیا اور کہا: جلدی کرو ورنہ یہ اپنی عقلمندی اور تیز سوچ سے ہمارا سارا مال لے جائے گا۔

❋ ❋ ❋